اشک و تبسّم

جبران خلیل جبران

مترجمہ

جبیب اشعر دہلوی

آئینۂ ادب چوک مینار انارکلی لاہور

جملہ حقوق محفوظ

بار پنجم ۱۹۶۳ء
تعداد : ۱۰۰۰
قیمت : چھ روپے

اہتمام
م، ع، سلام۔ آئینۂ ادب
چوک مینار انارکلی
لاہور

(اشرف پریس لاہور)

فہرست

۱۔ آغاز	۹
۲۔ حیاتِ شوق	۱۱
۳۔ کہانی	۱۶
۴۔ مُردوں کی بستی میں	۲۴
۵۔ شاعر کی موت اس کی زندگی ہے	۲۸
۶۔ جَل پریاں	۳۲
۷۔ رُوح	۳۶
۸۔ اشک و تبسّم	۳۸
۹۔ خواب	۴۳
۱۰۔ حق	۴۶
۱۱۔ آتشیں حروف	۴۹
۱۲۔ ویرانوں میں	۵۳
۱۳۔ ایک خواب	۵۷

۱۴ - کل اور آج	۶۴
۱۵ - رحم! اے نفس! رحم!!	۷۰
۱۶ - بیوہ اور اس کا بیٹا	۷۳
۱۷ - زمانہ اور قوم	۷۷
۱۸ - بارگاہِ جمال میں	۸۲
۱۹ - حکمت کی زیارت	۸۶
۲۰ - دوست کی کہانی	۹۰
۲۱ - حقیقت اور خیال	۹۷
۲۲ - قسمت کے مارے	۱۰۰
۲۳ - نالہ و شیون	۱۰۳
۲۴ - جھونپڑی اور محل	۱۰۷
۲۵ - دو بچے	۱۱۰
۲۶ - شعرائے سلف	۱۱۳
۲۷ - زیرِ آفتاب	۱۱۶
۲۸ - مستقبل پر ایک نظر	۱۱۸
۲۹ - ملکۂ خیال	۱۲۱
۳۰ - اے ملامت کار!	۱۲۶

۳۱ - کانا پھوسی	۱۲۹
۳۲ - مجرم	۱۳۳
۳۳ - رفیقۂ حیات	۱۳۶
۳۴ - سعادت کا گھر	۱۴۰
۳۵ - دیارِ ماضی	۱۴۲
۳۶ - ملاقات	۱۴۵
۳۷ - دلوں کے بھید	۱۵۰
۳۸ - اندھی قوت	۱۵۷
۳۹ - دو موتیں	۱۶۱
۴۰ - زمانہ کے اسٹیج پر	۱۶۵
۴۱ - میرے دوست!	۱۶۷
۴۲ - محبت کی کہانی	۱۷۱
۴۳ - بے زبان جانور	۱۷۵
۴۴ - مُصلح	۱۷۹
۴۵ - شاعر	۱۸۲
۴۶ - میرا یوم ولادت	۱۸۵
۴۷ - ولادتِ مسیحؑ	۱۹۶

۴۸ - روحوں کی سرگوشی	۲۰۳
۴۹ - اے ہوا!	۲۱۰
۵۰ - محبوب کی واپسی	۲۱۵
۵۱ - حسین موت	۲۲۴
۵۲ - گیت	۲۳۰
۵۳ - موج کا گیت	۲۳۲
۵۴ - بارش کا گیت	۲۳۴
۵۵ - حسن کا گیت	۲۳۶
۵۶ - سعادت کا گیت	۲۳۸
۵۷ - پھول کا گیت	۲۴۰
۵۸ - انسان کا ترانہ	۲۴۲
۵۹ - شاعر کی آواز	۲۴۴
۶۰ - خاتمہ	۲۵۵

آغاز

میں اپنے دل کے غم، دُنیا کی مسرّتوں سے نہیں بدلوں گا، اور نہ اس پر رضامند ہوں کہ وہ آنسو —— جنہیں غم میری رگ رگ سے نچوڑتا ہے —— "قہقہوں" میں تبدیل ہو جائیں۔

میں چاہتا ہوں: میری زندگی سرتاسر "اشک و تبسّم" رہے!

اشک —— جو میرے دل کی آلائشوں کو دھوتا ہے۔ جو مجھے زندگی کے راز اور اس کی نزاکتیں سمجھاتا ہے!

اور تبسّم —— جو مجھے بنی نوعِ انسان سے قریب کرتا ہے۔ جو میری پرستش —— دیوتاؤں کی پرستش کا اشارہ ہے۔

اشک —— جس سے میں پامال دلوں کا ساتھ دیتا ہوں۔

اور تبسّم —— جو میری "عشرتِ ہستی" کا عنوان ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ شوق و شیفتگی میں مر جاؤں اور یاس و حسرت کی زندگی بسر نہ کروں! میں چاہتا ہوں کہ میرے دل کی گہرائیوں میں حسن و عشق کے لئے ایک تشنگی —— ایک تڑپ ہو!! اس لئے کہ میری آنکھوں نے قناعت پسند دِلا

کو سب سے زیادہ بدقسمت اور سب سے زیادہ مادہ پرست دیکھا ہے، اور میرے کانوں نے اشتیاق و تمنّا کے مارے ہوئے عاشق کی آہوں کو آلاتِ موسیقی کی جھنکار سے زیادہ شیریں پایا ہے۔

شام کو پھول اپنی پتّیاں سمیٹ لیتا اور اپنے شوق سے ہم آغوش ہو کر سو جاتا ہے۔ اور جب صبح ہوتی ہے، تو آفتاب کے بوسہ کی پذیرائی کے لئے اپنے لبوں کو وا کر دیتا ہے۔

پھولوں کی زندگی، شوق و وصال —— اشک و تبسّم —— ہے!

سمندر کا پانی بخارات کی شکل میں اُٹھتا اور فضا میں جمع ہو کر بادل بن جاتا ہے۔ پھر ٹیلوں اور وادیوں پر سے گزرتا ہے، تا آنکہ لطیف ہوائیں اُسے مس کرتی ہیں اور وہ روتا ہُوا سبزہ زاروں میں گر پڑتا ہے اور ندی نالوں کے رستے اپنے وطن سمندر میں پہنچ جاتا ہے۔

بادلوں کی زندگی، ہجر و ملاقات —— اشک و تبسّم —— ہے!

اسی طرح انسان کی روح بھی "روحِ مطلق" سے جُدا ہو کر اس مادّی عالم میں آتی ہے اور بادل کی طرح غم کے پہاڑوں اور خوشی کے میدانوں سے گزرتی ہے، یہاں تک کہ موت کی لطیف ہوائیں اُسے چھوتی ہیں اور وہ پھر وہیں چلی جاتی ہے جہاں پہلے تھی —— حسن و عشق کے بحرِ ناپید اکنار میں! —— الوہیت کی آغوش میں!! ——

حیاتِ شوق

بہار

آ۔ میری محبوبہ! ویرانوں میں چلیں!!

برف پگھل چکی ہے اور زندگی اپنے شبستان سے نکل کر وادیوں اور گھاٹیوں میں جھومتی اُبھر رہی ہے۔

آ۔ میرے ساتھ آ، کہ ہم بہار کے نقشِ قدم کے ساتھ ساتھ —— دُور کھیت میں نکل جائیں۔

آ، ٹیلوں پر چڑھیں، اور آس پاس کے سرسبز و شاداب میدانوں کی نُزہت فروشیوں سے لطف اندوز ہوں!

دیکھ! "صبحِ بہار" نے وہ چادر پھیلا دی، جسے "شبِ سرما" نے تہ کر دیا تھا۔ سیب اور شفتالو کے درخت اس چادر میں ایسے معلوم ہو رہے ہیں، جیسے چودھویں رات کی چاندنی میں چوتھی کی دُلہن! انگور کی بیلیں جاگ اُٹھیں، اُن کی شاخیں عاشقوں کی طرح گلے مل رہی ہیں۔ نہریں جاری ہوگئیں اور خوشی کے راگ گاتی، چٹانوں میں رقص کر رہی ہیں، پھول بھی فطرت کے سینہ سے پھوٹ

نکلے، جیسے سمندر کے سینے سے حباب!

آ، نرگس کے پیالوں میں، بارش کے بچے کچھے آنسو پئیں خوشدل پرندوں کی چہکار سے اپنی رُوح کو لبریز کریں اورنسیم بہار کی عطرافشانیوں سے اپنے مشامِ جان کو راحت پہنچائیں!!

آ، اس چٹان کے پاس بیٹھ کر، جہاں بنفشہ کے پھول چھپے ہیں۔ ایک دوسرے کو پیار کریں!

گرمی:

آ، میری محبوبہ! کھیت میں چلیں!!

فصل کاٹنے کا زمانہ آگیا ہے، کھیتی اپنے شباب پر ہے، سُورج کے عشق کی حرارت نے، جو اُسے قطرت سے ہے، فصل کو اچھی طرح پکا دیا ہے۔

آ، اس سے پہلے کہ پرندے وہاں پہنچ کر ہماری محنت کو خاک میں ملا دیں، اور قطار اندر قطار چیونٹیاں ہماری زمین پر قبضہ جمالیں۔

آ، ہم زمین کے پھل چُنیں، جس طرح ہماری رُوح نے، وفا کے بیجوں سے ــــ جنہیں محبت نے ہمارے دل کی گہرائیوں میں بو دیا تھا ــــ نیک بختی کے دانے چُنے ہیں، اور عناصر کے باہمی اختلاط کے نتیجہ ــــ پیداوار ــــ سے اپنے خزانے بھر لیں، جس طرح زندگی نے ہمارے جذبات کے پیمانے کو

بھرا ہے!
آ، میری محبوبہ! ہم آسمان کو اپنا اوڑھنا اور گھاس کو اپنا بچھونا بنائیں، مُٹھی بھر پھونس کو تکیہ بنا کر سرہانے رکھیں اور وادی میں بہتی ہوئی ندی کی کہانیوں سے دن بھر کی تکان دُور کریں۔

خزاں:

آ، میری محبوبہ! انگور کی بیلوں میں چلیں!!
انگوروں کا رس نچوڑ کے برتنوں میں محفوظ کر لیں، جس طرح دماغ قوموں کے فلسفہ کو محفوظ کر لیتا ہے۔
آ، خشک پھل جمع کریں، پھولوں کا عرق نکالیں اور اس طرح نقل سے اصل کا لُطف اُٹھائیں۔
اب ہمیں واپس آبادی میں چلنا چاہیئے!
درختوں کے پتّے زرد ہو گئے ہیں اور ہَوا نے اُنھیں اِدھر اُدھر بکھیر دیا ہے۔ گویا اُن پھولوں کو ان سے کفنانا چاہتی ہے، جو موسمِ گرما کے گزر جانے سے مُردہ ہو چکے ہیں۔
آ، پرندے ساحلوں پر چلے گئے ہیں اور چمن کی شگفتگی بھی اُن کے ساتھ رخصت ہو گئی ہے۔ چنبیلی اور جوہی کے پھولوں پر وحشت برس رہی ہے اور

اُن کے ننّھے منّھے آنسو بھی زمین میں جذب ہو چکے ہیں!
چلو! اب گھر واپس چلیں!!
ندیاں مُرگ چکی ہیں، چشموں کے اشک مسرت خشک ہو چکے ہیں۔
اور ٹیلوں نے اپنا خوش نما لباس اُتار کر پھینک دیا ہے۔
آہ، فطرت کو نیند آرہی ہے اور وہ اشتہا انگیز ہنڈولوں نغموں سے بیداری کو رخصت کر رہی ہے۔

جاڑا:

میری رفیقۂ حیات! میرے پاس آ، یہ خاکی سانسوں کو موقع نہ دے کہ وہ ہمارے جسموں کو جدا کر دیں!!
اس آتشدان کے سامنے، میرے پہلو میں بیٹھ! — آگ ہی تو موسم سرما کا مرغوب میوہ ہے۔ مجھے قوموں کے واقعات سُنا، میرے کان ہوا کی آہیں اور عناصر کی فریادیں سُنتے سُنتے پک گئے ہیں!
کھڑکیوں اور دروازوں کو بند کردے! فضا کا غضب ناک چہرہ میری رُوح کو لرزاتا ہے اور برف تلے دبے ہوئے شہر کو دیکھ کر — جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماں، اپنے جوانا مرگ اکلوتے بچّے کی لاش پر بیٹھی ماتم کر رہی ہے — میرا دل خون ہوا جاتا ہے۔

زندگی کے راستے میں میری ہم سفر! چراغ میں تیل ڈال دے، مجھے ڈر ہے، کہیں وہ بُجھ نہ جائے —— چراغ اپنے مُنہ کے سامنے لا! کہ میں وہ نقوش دیکھنے چاہتا ہوں۔ جو راتوں نے تیرے چہرے پر مرتسم کئے ہیں۔ جا، شراب کی صراحی لے کر آ! تاکہ ہم دونوں پئیں اور شراب کشید کرنے کا زمانہ یاد کریں۔

میرے قریب آ، میرے دل کی ملکہ! میرے قریب آ!! آگ بجھ چکی ہے اور راکھ اُسے دبائے دے رہی ہے —— مجھ سے چمٹ جا! چراغ بجھ چکا ہے اور تاریکی اُس پر چھا گئی ہے!!

دیکھ! نیند کے خمار نے ہماری آنکھوں کو بوجھل کر دیا ہے —— میری طرف دیکھ! اپنی اُن آنکھوں سے، جنہیں نیند کے غلبہ نے نرگسیں بنا دیا ہے —— مجھے اپنے گلے سے لگا! اس سے پہلے کہ نیند ہمیں گلے سے لگا لے —— مجھے بوسہ دے! کہ برف تیرے بوسہ کے سوا، ہر چیز پر غالب آگئی ہے۔

آہ! میری محبوبہ!! نیند کا سمندر کتنا گہرا ہے ——!!!

آ۔ میرے دل کی راحت!! اس دُنیا میں ..... صبح کتنی دُور ہے۔!!!

کہانی

نہر کے کنارے، اخروٹ اور بید مشک کے درختوں کی چھاؤں تلے، ایک غریب کسان کا لڑکا بیٹھا بہتے پانی کو نہایت سکون و خاموشی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ یہ نوجوان کھیتوں میں پروان چڑھا تھا۔ جہاں ہر چیز محبت کی کہانی سناتی ہے۔ جہاں شاخیں آپس میں گلے ملتی ہیں، جہاں نسیم بہار، پھولوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہے۔ جہاں پرندے محبت کے راگ الاپتے ہیں، اور جہاں فطرت — اپنی تمام تر نظر فریبیوں کے ساتھ —— روحانیت کی تلقین کرتی ہے۔

اس بیس سالہ نوجوان نے، کل ایک دوشیزہ کو، چشمہ کے کنارے حسین لڑکیوں کے جھرمٹ میں دیکھا اور عاشق ہو گیا۔ لیکن جب اُسے یہ معلوم ہُوا کہ وہ بادشاہ کی لڑکی ہے تو اُس نے اپنے دل کو ملامت کی اور اپنی روح سے خود اس کی شکایت۔ مگر بے سود! ملامت دل کو محبت سے باز رکھ سکتی ہے نہ شکایت روح کو حقیقت سے ہٹا سکتی ہے۔ انسان اپنے دل اور روح کے درمیان اس نرم و نازک شاخ کی مثال ہے جو شمالی اور جنوبی ہواؤں کی زد میں ہو!

نوجوان نے نگاہ اُٹھائی: بنفشہ کے پھُول، بابونہ کے پھولوں کے ہم پہلو اُگے ہوئے تھے، اور بُلبل قمری سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ اُسے اپنی تنہائی پر رونا آگیا۔ محبّت کی گھڑیاں اس کی نگاہوں کے سامنے سے پرچھائیوں کی طرح گزر گئیں اُس نے کہا الفاظ اور آنسوؤں کے ساتھ اس کے جذبات بھی رواں تھے:

"یہ دیکھو! محبّت مجھ سے مذاق کر رہی ہے۔ اُس نے مجھے اپنا کھلونا بنا لیا ہے، اور ایک ایسی جگہ لاکر چھوڑ دیا ہے جہاں آرزوئیں عیب سمجھی جاتی ہیں اور تمنّائیں ذلّت!!

محبّت نے ـــ جس کا میں پجاری ہوں ـــ میرے دل کو تو شاہی محل میں اُچھال پھینکا اور میری زندگی کو ایک غریب کسان کی پست و زبوں جھونپڑی میں دھکیل دیا۔ آہ! اُس نے میری رُوح کو اُس پری وش کے حُسن کا اسیر کر دیا، جسے لوگ ہر وقت گھیرے رہتے ہیں اور اقتدارِ اعلیٰ جس کی حفاظت کرتا ہے!!

اے محبّت! میں تیرا حلقہ بگوش ہوں، پھر تو مجھ سے کیا چاہتی ہے؟ میں تیرے پیچھے پیچھے آتشیں رستوں پر چلا اور شعلوں نے مجھے لپک لیا۔ میں نے اپنی آنکھیں کھولیں، لیکن تاریکی کے سوا مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے اپنی زبان کو جنبش دی۔ لیکن یاس و نومیدی کے سوا ایک لفظ میرے مُنہ سے نہ نکلا۔

اے محبّت! "شوق" نے مجھے ایک "روحانی تشنگی" سے ہم کنار کر دیا ہے'

جو محبوب کے بوسہ کے سوا کسی چیز سے نہیں بجھ سکتی۔

میں کمزور ہوں، اے محبت! اور تو قوی، پھر مجھ سے کیوں جھگڑتی ہے؟ میں بے گناہ ہوں اور تو عادل، پھر مجھے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ کیوں بناتی ہے؟ مجھے کیوں ذلیل کرتی ہے؟ جبکہ تیرے سوا میرا کوئی مددگار نہیں! مجھ سے بے تعلق کیوں ہوتی ہے؟ جبکہ تو ہی میری خلقت کا سبب ہے! اگر میرا خون تیری مرضی کے خلاف میری رگوں میں گردش کرے تو اسے بہا دے! اگر میرے قدم تیری راہ کے سوا دوسرا ہی جنبش کریں تو انھیں کاٹ ڈال! اس جسم کے ساتھ جو تیرا جی چاہے کر، لیکن میری روح کو ان پُرسکون کھیتوں میں اپنے زیرِ سایہ لطف اٹھانے دے!!

نہریں اپنے محبوب سمندر کی طرف رواں ہوتی ہیں، پھول اپنے معشوق نور کے لئے مسکراتے ہیں، بادل اپنی ارادت مند وادی میں اُترتے ہیں، لیکن میں — جس کی بپتا سے نہریں واقف ہیں، نہ پھول اور بادل — خود کو اپنے غم میں تنہا اور اپنی محبت میں اکیلا پاتا ہوں، "اس" سے دُور، جو مجھے اپنے باپ کی فوج کا سپاہی بنانا پسند کرے گی نہ اپنے محل کا خادم!"

نوجوان تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ گویا نہر کی نغمہ آگیں روانی

اور شاخوں کے پتوں کی لطیف سرسراہٹ سے گفتگو کا سلیقہ سیکھنا چاہتا ہے۔ اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا:

"اے وہ کہ میں تیرے نام سے اس قدر مرعوب و خائف ہوں کہ تجھے تیرا نام لے کر پکار بھی نہیں سکتا! اے شان و شکوہ کے پردوں اور عظمت و جلال کی دیواروں میں مجھ سے چھپنے والی! اے وہ حور لقا، کہ ابدیت کے سوا ــــ جہاں ہر طرف مساوات ہی مساوات ہے ــــ میں تجھ سے ملنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا! اے وہ کہ تلواریں تیری اطاعت کرتی ہیں اگرچہ نہیں تیرے سامنے خم ہوتی ہیں اور خزانوں اور عبادت گاہوں کے دروازے تیرے لئے کھُلے رہتے ہیں! تُو نے میرے دل پر قبضہ کر لیا ہے، جسے محبت نے مقدس کیا تھا۔ میری روح کو اپنا غلام بنا لیا ہے، جسے اللہ نے شرف و امتیاز بخشا تھا اور میری عقل کو پرچا لیا ہے، جو کل تک ان کھیتوں کی آزاد فضا میں بے فکر تھی لیکن آج محبت کی زنجیروں میں مقید ہے۔

اے حسین دوشیزہ! جب میں نے تجھے دیکھا، تو اپنی تخلیق کی غایت کو پا لیا۔ لیکن جب میری نظر تیری بلندی اور اپنی پستی پر گئی، تو مجھے معلوم ہو گیا فطرت کے کچھ راز ہیں، جو انسان کی سمجھ میں نہیں آ سکتے، اور کچھ راستے ہیں جو روح کو ایک ایسے مقام پر لے جاتے ہیں جہاں محبت انسانی قانون سے بالاتر

ہو کر حکومت کرتی ہے۔

اے غزالِ رعنا! جب میں نے تیری مست انکھڑیاں دیکھیں تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ زندگی ایک جنت ہے اور انسان کا دل، اس کا دروازہ! لیکن جب تیری عظمت اور اپنی ذلت کو مارِ دار اور رِیباں کی طرح آپس میں گتھم گتھا ہوتے پایا تو جان لیا کہ یہ زمین میرا وطن نہیں ہو سکتی۔

اے حسن و جوانی کے پیکرِ لطیف! جب میں نے تجھے حسین لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھے دیکھا ۔ جیسے پھولوں میں گلاب! تو گمان کیا کہ میرے خوابوں کی دُلہن نے انسانی قالب اختیار کر لیا ہے، لیکن جب مجھے تیرے باپ کی بزرگی، اور مرتبہ کا علم ہُوا، تو میری سمجھ میں آگیا کہ گلاب کا پھول توڑنے سے پہلے ان کانٹوں سے سابقہ پڑتا ہے جو انگلیوں کو زخمی کر دیتے ہیں۔ ہاں! میری سمجھ میں آگیا کہ جو کچھ خواب جمع کرتے ہیں، بیداری اُسے منتشر کر دیتی ہے۔"

نوجوان اٹھا اور ان الفاظ میں یاس و نومیدی کی تصویر کھینچتا ہُوا شکستہ دلی اور بے دلی کے ساتھ چشمہ کی طرف روانہ ہُوا:

"اے موت! آ، اور مجھے زندگی کی قید سے چھڑا لے! یہ وہ سرزمین جہاں کانٹے پھولوں کا گلا گھونٹتے ہوں، رہنے کے قابل نہیں۔

آ، اور مجھے اس زمانے سے نجات دے، جس میں محبت کو عظمت کی کرسی

سے اُتار کر اس کی جگہ دُنیوی عزّت کو بٹھا دیا گیا ہے۔

مجھے آزاد کر، اے موت! دو محبّت بھرے دلوں کی ملاقات کے لئے آغوشِ ابد اس دُنیا سے کہیں زیادہ موزوں ہے۔ وہاں میں اپنی محبوبہ کا انتظار کروں گا! اور وہیں ہم دونوں ملیں گے!!

جب وہ چشمہ پر پہنچا ہے، شام ہو چکی تھی اور سُورج نے اُس کھیت سے اپنی سنہری چادر سمیٹنی شروع کر دی تھی۔ حسین شہزادی کے قدموں تلے روندی ہوئی زمین پر بیٹھ کر وہ رونے لگا۔ اس نے اپنا سر سینہ کی طرف جھکا لیا، گویا "قلبِ گریزاں" پر قابو پانا چاہتا ہے۔

اس اثناء میں بید مشک کے درختوں میں سے ایک دوشیزہ سبزے کو اپنے دامنوں سے نہال کرتی نمودار ہوئی۔ وہ نوجوان کے پہلو میں آ کھڑی ہوئی اور اپنا نرم و نازک ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ نوجوان نے گھبرا کر نگاہ اُٹھائی۔ اس سونے والے کی طرح جسے سُورج کی شعاعوں نے بیدار کر دیا ہو۔ اس نے دیکھا شہزادی سامنے کھڑی ہے۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا، جس طرح موسیٰ طور کی چوٹی پر اپنے محبوب کا جلوۂ روشن دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن اس کی زبان نے جواب دے دیا اور اشک آلود آنکھوں نے زبان کا فرض ادا کیا۔

دوشیزہ نے اسے گلے لگایا۔ ہونٹوں اور آنکھوں کو بوسہ دیا۔ گرم گرم
کرنوں کو چوسا اور بانسری سے زیادہ شیریں آواز میں بولی:
"میرے محبوب! میں نے تمہیں خوابوں میں دیکھا ہے، تنہائیوں میں تمہارے
تصور سے جی بہلایا ہے، تم میری روح کے رفیق ہو جسے میں نے گم کر دیا تھا،
تم میری ذات کے حسین نصف آخر ہو، جو اس دُنیا میں آنے سے پہلے مجھ سے
جُدا کر لیا گیا تھا۔

میں چوری چھپے تم سے ملنے آئی ہوں، میرے حبیب! دیکھو، اس وقت
تم میری آغوش میں ہو۔ پریشان نہ ہو؛ میں اپنے باپ کے جاہ و حشم پر لات مار
کر آئی ہوں، تاکہ تمہارے ہمراہ کسی دُور دراز مقام پر چلی جاؤں اور ہم دونوں
زندگی اور موت کے جام ایک ساتھ پئیں۔

اُٹھو، میرے پیارے! ہم انسانوں سے دُور ـــ بہت دُور ـــ
کسی ویرانے میں چلیں"۔

وہ دونوں ـــ ایک دوسرے کو چاہنے والے ـــ درختوں میں
سے ہو کر کہیں چلے گئے۔ رات کے پردوں نے انہیں روپوش کر دیا تھا۔
اور وہ بادشاہ کی قوت اور عظمت کی پرچھائیوں سے بے خوف، چلے جا رہے
تھے۔

شاہی جاسوسوں کو شہر کے آس پاس دو انسانی ڈھانچے ملے، جن میں سے ایک کے گلے میں ہار تھا۔ قریب ہی ایک پتھر پڑا تھا جس پہ یہ الفاظ کندہ تھے:

ہمیں محبّت نے ملایا ہے، پھر کون ہے جو ہمیں جُدا کر سکے؟ ہمیں
موت نے اپنی پناہ میں لیا ہے، پھر کون ہے جو ہمیں اس کی
پناہ سے نکال سکے؟!

مُردوں کی بستی میں

کل — میں شہر کے ہنگاموں سے اُکتا کر پُرسکون سبزہ زاروں میں ٹہلنے کے لئے نکلا اور ایک بلند پہاڑی پر پہنچ کر، جسے فطرت نے حسین ترین لباس پہنا رکھا تھا ٹھہر گیا۔ شہر اپنی ساری بلند عمارتوں اور عالی شان محلّوں کے ساتھ کارخانوں کے دھوئیں کے کثیف بادل میں دبا ہُوا نظر آ رہا تھا۔

میں بیٹھ گیا اور دُور سے انسان کی عملی زندگی کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے وہ سرتاسر "مشقّت" نظر آئی۔ میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب انسان کی اس بناوٹی زندگی پر غور نہ کروں اور اپنا رُخ اس سبزہ زار کی طرف کر لیا جو عظمت خداوندی کی جلوہ گاہ تھی۔ میں نے دیکھا اس سبزہ زار کے وسط میں ایک قبرستان ہے جس کی مرمریں قبریں سرو کے درختوں سے گھری ہوئی نظر آ رہی ہیں۔

وہاں — زندوں اور مُردوں کی بستی کے درمیان — میں امن بستی کی مسلسل کشمکش اور دائمی حرکت اور اس بستی پر چھائی ہوئی خاموشی اور مستقل سکون کے متعلق بیٹھا سوچ رہا تھا۔

ایک طرف اُمیدیں تھیں اور نا امیدیاں، محبّت تھی اور نفرت، امیری تھی اور غریبی، اعتقاد تھا اور بے اعتقادی۔

اور دوسری طرف مٹی میں مٹی تھی، جس کے باطن کو ظاہر سے بدل کر فطرت اس سے نباتات، پھر حیوانات پیدا کرتی ہے، اور یہ سب کچھ دات کی خاموشی میں ہو جاتا ہے۔

میں اپنے انہیں افکار میں گم تھا کہ میری توجہ ایک آہستہ رو جمِ غفیر نے اپنی طرف مبذول کر لی۔ آگے آگے بینڈ تھا، جس کے غم انگیز نغموں سے فضاء پُر اُداسی چھا گئی تھی۔

یہ ایک بہت بڑا مجمع تھا، جس میں عظمت و اقتدار کے دیوتا شامل تھے، ایک عظیم المرتبت رئیس کا جنازہ تھا —— ایک مردہ کی ہڈیاں تھیں جس کے پیچھے پیچھے زندہ لوگ روتے، واویلا مچاتے اور فضا کو اپنے نالہ و ماتم سے گراں بار کرتے چلے آ رہے تھے۔

جنازہ قبرستان پہنچا۔ پادری جمع ہوئے اور عود و لوبان سُلگا کر مُردہ کے حق میں دعائے مغفرت کی۔ ادھر بینڈ بجانے والوں نے ایک طرف ہو کر ماتم کا بینڈ بجایا۔ اس کے بعد خطیب آگے بڑھے اور نہایت فصیح و بلیغ الفاظ میں مرنے والے پر ماتم کیا۔ پھر شاعروں نے اپنے اپنے مرثیے پڑھے جن میں سوز و گداز

کے ساتھ ساتھ معنوی لطافتیں بھی تھیں۔ یہ سب کچھ اُکتا دینے والی طوالت کے بعد ختم ہُوا، اور مجمع رفتہ رفتہ اُس قبر سے رُخصت ہوگیا جس کے بنانے میں گورکنوں اور انجینوں نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی تھی اور جس پر بہترین ہاتھوں کے گوندھے ہوئے ہار پڑے تھے۔

لوگ شہر کی طرف واپس چلے گئے۔ لیکن میں دُور سے یہ سب کچھ دیکھتا اور اس پر غور کرتا رہا۔

سُورج ڈھل چکا تھا، چٹانوں اور درختوں کے سائے طویل ہو گئے تھے، اور فطرت نے شفق کا لباس اتارنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے نگاہ اُٹھائی اور دیکھا، دو آدمی ایک لکڑی کا تابوت اپنے کندھوں پر لئے چلے آرہے ہیں ان کے پیچھے ایک عورت ہے، جس کے جسم پر پھٹے پُرانے کپڑے، گود میں ایک دودھ پیتا بچہ اور پہلو میں ایک کُتا ہے۔ جو کبھی اس کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی تابوت کی طرف۔

یہ ایک مفلس کا جنازہ تھا، جس کے پیچھے ایک اس کی بیوی تھی، جو یاس و نومیدی کے آنسو بہا رہی تھی۔ ایک اس کا بچہ تھا، جو اپنی ماں کو روتے دیکھ دیکھ کر رو رہا تھا، اور ایک اس کا وفادار کُتا جس کی رفتار سے اس کے رنج و غم کا اظہار ہوتا تھا۔

یہ لوگ قبرستان پہنچے اور تابوت کو ایک قبر میں اُتار دیا، جو مریں قبروں سے بہت دُور ایک گوشہ میں تھی۔ اس کے بعد وُہ پُراثر خاموشی کے ساتھ واپس ہوئے۔ کُتّا بار بار اپنے آقا کی آخری آرام گاہ کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وُہ سب درختوں میں روپوش ہو گئے۔

اس وقت میں نے شہر کی طرف دیکھ کر اپنے دل میں کہا:

"یہ دولت اور قوّت والوں کے لئے ہے!"

پھر قبرستان کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

"اور یہ بھی دولت اور قوّت والوں کے لئے ہے!! پھر کمزوروں اور غریبوں کا وطن کہاں ہے؟ میرے معبود!"

یہ کہہ کر میں نے تہ بہ تہ بادلوں کی طرف دیکھا، جن کے کنارے سُورج کی حسین شعاعوں سے سنہری ہو گئے تھے۔ میرے دل سے آواز آئی:

"وہاں —!"

شاعر کی موت اُس کی زندگی ہے

رات نے ڈیرے ڈال دئے تھے اور برف باری نے سارے شہر کو سفید لباس پہنا دیا تھا۔ سردی اس بلا کی تھی کہ اہلِ شہر بازاروں سے بھاگ کر اپنے اپنے مکانوں میں جا چھپے تھے۔ ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی، جیسے کوئی غم زدہ سنگین قبروں کے درمیان اپنے عزیز کی موت پر —— جسے بیجۂ شیر نے زندگی کی لذتوں سے محروم کر دیا ہو —— سسکیاں بھرے!

شہر کے کنارے ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے ستون خمیدہ اور چھت برف کی شدت سے اس قدر جھک گئی تھی، گویا گرا ہی چاہتی ہے۔ اس مکان کے ایک گوشہ میں پھٹے پرانے بستر پر ایک قریب المرگ آدمی پڑا تھا۔ اس کی نگاہیں ایک ٹمٹماتے چراغ پر تھیں۔ جو ہر ساعت تاریکی پر غالب آنا چاہتا تھا اور ہر لحظہ مغلوب ہو جاتا تھا۔

ایک نوجوان —— جسے معلوم تھا کہ اب زندگی کے جھگڑوں سے چھٹکارا پانے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اس کے زرد چہرہ پر امید کی روشنی تھی اور

خشک ہونٹوں پر مایوس تبسم!

ایک شاعر — جو اپنی خوش نوائیوں سے قلب انسانی کو مسرت بخشنے آیا تھا، رَجے پنچے لوگوں کی بستی میں بھوک سے تڑپ تڑپ کر جان دے رہا تھا۔

ایک شریف انسان — جو زندگی کو شاد کام بنانے کے لئے یزدانی برکتوں کا مژدہ لے کر اُترا تھا، اس سے پہلے کہ انسانیت اس پر مُسکرائے دُنیا سے رُخصت ہو رہا تھا۔

اس کے آخری سانس نزع کی کشمکش میں مبتلا تھے اور کوئی اس کے پاس نہ تھا۔ سوائے اس ٹمٹماتے چراغ کے جو اس کا مونس تنہائی تھا، اور ان اوراقِ پریشاں کے جن پر اس کے لطیف روحانی خیالات مرتسم تھے۔

اس جاں بلب جوان مرگ نے اپنی باقی تمام قوتوں کو، جو آغوش اجل میں آسودہ ہونے ہی والی تھیں، جمع کیا، اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھائے اور نیم مُردہ پلکوں کو اس طرح جنبش دی، گویا وہ تماشائے انجم کے لئے اپنی آخری نگاہوں سے جھونپڑے کی چھت کو پھاڑ دینا چاہتا ہے۔

وہ کہنے لگا:

"آ، اے حسین موت! آ!! میری روح تیری مشتاق ہے، میرے قریب آ، اور مادّی قیدیں توڑ دے۔ میں اس لامتناہی سلسلہ سے اُکتا گیا ہوں۔

آ، اے شیریں موت! اور مجھے ان لوگوں میں سے نکال، جو مجھے اجنبی سمجھتے ہیں، صرف اس بناء پر کہ میں جو کچھ فرشتوں سے سُنتا ہوں، انسانی زبان میں ادا کر دیتا ہوں۔

آ، جلدی سے میرے قریب آ، کیونکہ دُنیا میرے خیال سے فارغ ہے، اس نے مجھے گوشۂ نسیاں میں ڈال دیا ہے۔ صرف اس بات پر کہ میں اس کی طرح مال و دولت کی پُوجا نہیں کرتا اور نہ اپنے سے کمزور کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہوں۔

آ، اے میری من موہنی! آ، اور مجھے اپنے ساتھ لے چل، کیونکہ میرے ہم جنسوں کو اب میری ضرورت نہیں رہی۔ آ، اور مجھے اپنے محبت بھرے سینے سے چمٹا لے، میرے اُن ہونٹوں کو بوسہ دے، جو کبھی اپنی ماں کے پیار سے لذت آشنا نہیں ہوئے، جنھوں نے کبھی اپنی بہن کے رخساروں کو مَس نہیں کیا اور جنھوں نے آج تک اپنے محبوب کے چہرہ کا بوسہ نہیں لیا۔

آ، میری پیاری موت! جلدی آ، اور مجھے آزاد کر!!"

اس وقت مرنے والے کے بستر کی جانب، نسوانی سایہ تھا، غیر مادی اور متحرک سایہ! جس کے جسم پر سفید برف سا لباس تھا اور ہاتھوں میں فردوسی پھولوں کا تاج۔

سایہ رینگا اور اس کے گلے لگ گیا۔ اس نے شاعر کی آنکھوں کو بند کر دیا، تاکہ وہ روح کی آنکھوں سے مشاہدہ کرے اور اس کے لبوں کو محبت کا بوسہ دیا —— وہ بوسۂ محبت جس نے اس کے ہونٹوں پر ابدی تبسّم چھوڑ دیا۔

اب اس گھر میں مٹی کے ایک ڈھیر اور ان اوراق کے سوا، جو اندھیرے میں اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے، اور کچھ نہ تھا۔

صدیاں بیت گئیں اور اس شہر کے رہنے والے بے حسی، لاپروائی اور تنگ خیالی کی نیند سوتے رہے۔ بالآخر جب وہ بیدار ہوئے اور ان کی آنکھیں صبحِ معرفت کے نور سے روشن ہوئیں تو اُنھوں نے "میدانِ عام" میں اس شاعر کا بُت نصب کیا اور ہر سال اس کی برسی منانے لگے۔

آہ! انسان کی نادانی!!

جل پریاں

مشرقی جزیروں کے گرد پھیلے ہوئے سمندر کی گہرائیوں میں جہاں بے شمار موتی ہیں، ایک نوجوان کی لاش پڑی تھی۔ پاس ہی سنہرے بالوں والی جل پریاں مرجان زار میں بیٹھی اپنی حسین نیلی آنکھوں سے لاش کی طرف دیکھ دیکھ کر ترنم انگیز لہجہ میں باتیں کر رہی تھیں۔

ان کی گفتگو سمندر نے سُنی، موجیں اسے ساحل تک لے گئیں اور وہاں سے ہوا کے لطیف جھونکے مجھ تک پہنچا گئے۔

ایک بولی:

"یہ آدمی، کل اس وقت پانی میں اُترا تھا جب سمندر بپھرا ہُوا تھا۔"

دوسری نے کہا:

"سمندر تو بپھرا ہُوا نہیں تھا، ہاں انسان —— جو اپنے تئیں دیوتاؤں کا جوہر سمجھتا ہے —— ایک خوف ناک جنگ میں مبتلا ہے، جس میں اب تک اتنی خوں ریزی ہو چکی ہے کہ پانی کا رنگ سُرخ ہو گیا ہے۔ یہ آدمی اسی جنگ کے

مقتولوں میں سے ہے۔"

تیسری نے کہا:

"جنگ و ننگ کو تو میں جانتی نہیں، کیا بلا ہے، ہاں یہ جانتی ہوں کہ انسان نے خشکی پر غلبہ پالینے کے بعد حرص کی کہ سمندر پر بھی حکومت کرے، نت نئے آلے بنائے اور ان سے سمندروں کے سیلاب کو کاٹا۔ جب اس کی اطلاع نبتون ـــ پانی کے دیوتا ـــ کو ہوئی تو وہ اس دراز دستی پر بہت برہم ہوا، اور انسان کے لئے سوائے قربانی کے کوئی چارۂ کار نہ رہا، جس سے وہ ہمارے بادشاہ کو رضامند کر سکتا۔ وہ مردہ اجسام، جنہیں ہم نے کل پانی میں گرتے دیکھا تھا، نبتونِ اعظم کے حضور انسان کی آخری قربانی تھے۔"

چوتھی نے کہا:

"نبتون کتنا جلیل القدر مگر کتنا سنگ دل ہے، اگر میں جل رانی ہوتی تو کبھی خونی پیش کشوں سے خوش نہ ہوتی۔ آؤ! اس نوجوان کی لاش کو دیکھیں ممکن ہے نوعِ انسانی کے متعلق کوئی بات معلوم ہو جائے۔"

جل پریاں نوجوان کی لاش کے قریب آئیں اور اس کی جیبیں ٹٹولنے لگیں۔ دل سے متصل جیب کے اندر ایک خط نظر آیا۔ ایک نے بڑھ کر اسے نکال لیا اور پڑھنے لگی:

"میرے حبیب"!

رات آدھی گزر چکی ہے اور میں جاگ رہی ہوں، اس عالم کسمپرسی میں اگر کوئی تسلی دینے والا ہے تو میرے آنسو، یا یہ امید کہ تم جنگ کے چنگل سے نکل کر زندہ سلامت میرے پاس آؤ گے۔

میں اب سوچ بچار کے قابل بھی نہیں رہی، اگر کبھی سوچتی ہوں تو تمہارے وہ الفاظ جو چلتے وقت تم نے مجھ سے کہے تھے: "ہر انسان کے پاس آنسوؤں کی ایک امانت ہوتی ہے، جو ایک نہ ایک دن واپس کرنی ضروری ہے"۔

پیارے! سمجھ میں نہیں آتا تمہیں کیا لکھوں؟ اپنے دل کو کیوں نہ کاغذ پر نکال کر رکھ دوں۔

دل ـــــ جسے بدبختی مبتلائے عذاب کرتی ہے اور درد کو لذت اور غم کو مسرت بنا دینے والی محبت تسکین دیتی ہے۔

جب محبت نے ہمارے دلوں کو ایک کیا تھا تو ہمیں اُمید تھی، ہمارے جسم آپس میں اس طرح گھُل مل جائیں گے کہ ان دونوں میں ایک ہی رُوح گردش کرے گی۔

اچانک جنگ نے تمہیں پکارا اور تم "فرض" اور "وطنیت" کے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے پیچھے ہو لئے۔

یہ کون سا "فرض" ہے جو دو محبت کرنے والوں کو جدا کر دے۔ عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم بنا دے؟

یہ کون سی "وطنیت" ہے جو معمولی باتوں پر شہروں کو تباہ و غارت کرنے کے لئے جنگ برپا کرا دے؟

یہ کیسا "اہم فرض" ہے جو غریب دیہاتیوں کے لئے تو ناگزیر ہے، مگر طاقت ور اور مورثی شریف زادے اس کی بالکل پروا نہیں کرتے۔

اگر "فرض" قوموں کی سلامتی کو تباہ اور "وطنیت" حیاتِ انسانی کے سکون کو برباد کر دے، تو ایسے "فرض" اور ایسی "وطنیت" کو دُور ہی سے سلام! ——

نہیں نہیں، میرے عجیب اتم بیری باتوں کی پروا نہ کر، اور وطن کے لئے زیادہ سے زیادہ بہادری اور جاں نثاری کا ثبوت دو۔ اس لڑکی کی باتوں پر کان نہ دھرو جسے محبت نے اندھا کر دیا ہے، جس کی عقل پر جدائی نے پردہ ڈال دیا ہے۔ اگر محبت نے تمہیں زندہ و سلامت میرے پاس پہنچا دیا تو آنے والی زندگی میں مجھے تم سے ضرور ملا دے گی۔"

جل پریوں نے وہ خط نوجوان کی جیب میں اُسی طرح رکھ دیا اور غم ناک خاموشی کے ساتھ واپس ہو گئیں۔ تھوڑی دُور جا کر ان میں سے ایک نے کہا:

"انسان کا دل تو نبوتوں کے دل سے بھی زیادہ سخت ہے!"

رُوح

.....اور خداؤں کے خدا نے اپنی "ذات" سے ایک "روح" علیحدہ کر کے پہلے اسے حسن و جمال عطا فرمایا، پھر نسیم سحر کی نرمی، گل ہائے چمن کی خوشبو، اور نورِ قمر کی لطافت۔

اس کے بعد اسے عشرت کا ایک جام دیا اور کہا:

"یہ تو اس وقت پینا جب "غمِ دیروز" سے غافل اور "فکرِ فردا" سے بے نیاز ہو جائے!"

پھر غم کا ایک جام دیا اور کہا:

"اس کے پینے پر زندگی کی مسرتوں کا راز تیری سمجھ میں آجائے گا!"

پھر اس میں وہ محبت پیدا کی، جو کم حوصلگی کی پہلی آہ کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے، اور وہ رس جو غرور کے پہلے بول کے ساتھ رخصت ہو جاتا ہے۔

پھر اس پر آسمانی علم اتارا، جو سچائی کے راستوں کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے، اس کی گہرائیوں میں ایک بصیرت پیدا کی، جو غیر مرئی چیزوں کو دیکھتی ہے اور اس میں ایک جذبہ ودیعت کیا، جو خیالات کے ساتھ بہتا اور تصورات کے

ساتھ چلتا ہے۔

پھر اُسے تمنا کا لباس پہنایا، جسے فرشتوں نے قوسِ قزح کی لہروں سے بُنا تھا۔

اس کے بعد اس میں حیرت کی تاریکی پیدا کی — اور وہ نور کا سایہ ہے!

اور خداؤں کے خدا نے قہر و غضب کی بھٹی سے "آگ" جہالت کے صحراؤں سے "ہوا" انانیت کے ساحلِ سمندر سے "ریگ" اور زمانے کے قدموں تلے سے "مٹی" لی اور ان سب کے باہمی امتزاج سے انسان کو پیدا کیا۔[1]

پھر اسے ایک اندھی قوت عطا کی، جو "جنون" کے وقت بھڑک اُٹھتی اور خواہشوں کے سامنے بجھ جاتی ہے۔

اس کے بعد اس میں زندگی پیدا کی — اور وہ موت کا سایہ ہے!

خداؤں کا خدا پہلے ہنسا، پھر رو دیا، اس نے محبت کا بے پایاں جذبہ محسوس کیا اور انسان اور اس کی روح کو آپس میں ملا دیا۔

---

[1] قدیم اطباء کے نظریہ کے مطابق انسان کی تخلیق عناصرِ اربعہ — آتش و آب و خاک و باد — سے ہوئی ہے۔ یہاں مصنف نے "ریگ" سے "پانی" مراد لیتے ہوئے اسی نظریہ کی تائید کی ہے۔ (مترجم)

اشک و تبسّم

سُورج نے اپنے دامن ان سرسبز نزہت گاہوں سے سمیٹ لیے، اور چاند نے اُفق سے طلوع ہو کر ان پر لطیف روشنی پھیلا دی۔ میں وہاں —— درختوں کے نیچے —— بیٹھا فضا کے انقلابِ حال پر غور کر رہا تھا۔ شاخوں میں سے ستاروں کو دیکھ رہا تھا، جو آسمان پر اس طرح بکھرے ہوئے تھے، جیسے بساطِ نیلگوں پر اشرفیاں اور دُور سے وادی کی نہروں کے نغمے سُن رہا تھا۔

جب پرندوں نے ہری بھری شاخوں پر بسیرا لے لیا، پھولوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور خاموشی بر سرِ اقتدار آ گئی تو مجھے گھاس پر ہلکے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ مَیں نے مُڑ کر دیکھا ایک نوجوان جوڑا میری طرف آ رہا تھا۔ ایک گھنے درخت کے قریب پہنچ کر وہ بیٹھ گیا، اس طرح کہ وہ مجھے نظر آ رہا تھا، لیکن میں اس کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد نوجوان نے چاروں طرف دیکھ کر کہا:

"آہ، میری پیاری! میرے پہلو میں بیٹھ کر میری بات سنو!!
مسکراؤ! کہ تمہاری مسکراہٹ ہمارے مستقبل کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

خوش ہو جاؤ! کہ زمانہ ہماری وجہ سے خوش ہے۔
میرے دل نے مجھے اس شک سے آگاہ کر دیا ہے، جو تمہارے دل میں بیٹھ گیا ہے۔ شک آئینِ محبت میں گناہ ہے! میری پیاری!!
تم بہت جلد اس وسیع جائداد کی مالک بننے والی ہو، جسے یہ روپہلی چاند روشن کر رہا ہے، اور اس محل کی رانی، جو بادشاہوں کے محل سے ملتا جلتا ہے۔ تمہیں میرے خوبصورت اور موٹے تازے گھوڑے سیرگاہوں میں لے جایا کریں گے، اور میری حسین گاڑیاں سینما اور تھیٹر میں۔
مسکراؤ، میری پیاری! جس طرح سونا میرے خزانوں میں مسکراتا ہے اور مجھے غور سے دیکھو! جس طرح میرے والد کے جواہر مجھے تکتے ہیں۔
میری سنو، میری پیاری! میرا دل نہیں مانتا کہ تم سے اپنے راز چھپائے!
ہمارے سامنے "سالِ عروسی" ہے — ایک ایسا سال، جو ہم بے شمار سنہری سکوں کے ساتھ سوئٹزرلینڈ کے چشموں کے کنارے، اطالیہ کی سیرگاہوں میں دریائے نیل کے ساحلی مقاموں پر اور لبنان کے صنوبری درختوں

کی چھاؤں تلے بسر کریں گے۔ وہاں تمام معززا ور دولت مند عورتوں سے ملو گی، جو تمہارے زیورات و لباس کو حسد کی نگاہ سے دیکھیں گی۔ اور وہ زیورات و لباس میری طرف سے تمہارے حضور ایک معمولی "ہدیۂ محبت" ہوں گے! کیا اب بھی تم مطمئن نہیں ہو؟ میری پیاری!

آہ! کتنا شیریں ہے تمہارا تبسم، میری زندگی کے تبسم کا آئینہ دار!!

تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا، وہ دونوں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے پھولوں کو اپنے پاؤں تلے روندتے، جس طرح سرمایہ دار کا قدم محتاج کے دل کو روندتا ہے چلے جارہے ہیں۔

وہ دونوں میری نگاہوں سے چھپ گئے اور میں سوچنے لگا: "محبت کے نزدیک دولت کا مرتبہ کیا ہے؟" ——— دولت انسانی شرارتوں کی جڑ، اور محبت، نور و سعادت کا سرچشمہ!

میں اپنے انہیں افکار کی پرپیچ راہوں میں ڈونڈتا پھر رہا تھا کہ دو سائے نظر آئے اور میرے سامنے سے گزر کر گھاس پہ بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نوجوان لڑکا تھا اور دوسری نوخیز لڑکی۔ یہ کھیتوں کی طرف سے آئے تھے، جہاں کسانوں کی جھونپڑیاں ہیں۔

تھوڑی دیر کی قیامت اثر خاموشی کے بعد میں نے مُنا کوئی شکستہ دل

ٹھنڈے سانس بھر بھر کر کہہ رہا تھا:

"میری پیاری! امت روا! محبت ——— جس نے چاہا اور ہماری آنکھیں کھول کر اپنے حلقہ بگوشوں میں شامل کر لیا ——— صبر و اطمینان کی نعمت بھی عطا کرے گی۔

آنسو پونچھ اور صبر کر! کیونکہ ہم نے محبت کے دین پر قائم رہنے کی قسم کھائی ہے۔ اور اس کے لئے اب تک محتاجی کی تکلیفیں، بدبختی کی تلخیاں اور جدائی کی مصیبتیں برداشت کر رہے ہیں۔ میرے لئے زمانے سے جنگ کرنی ناگزیر ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے وہ مال غنیمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں، جو تیرے سامنے پیش کرنے کے لائق ہو اور جس سے ہم زندگی کے مراحل طے کرنے میں مدد لے سکیں۔ میری پیاری! محبت ——— اور محبت ہی خدا ہے ——— عود و لوبان کے بخارات کی طرح ہماری آہوں اور آنسوؤں کو قبول کرے گی اور ہمیں وہ صلہ ضرور دے گی، جس کے ہم مستحق ہیں۔

میری پیاری! اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ مجھے صبح ہونے سے پہلے جانا ہے!

اس کے بعد ایک نرم و نازک آواز میرے کانوں میں آئی، جسے گہرے

اور طویل آتشیں سانس منقطع کر رہے تھے — ایک دوشیزہ کی آواز! جس میں اس کے دل کی تمام کیفیات — محبت کی گرمی، جدائی کی تلخی اور صبر کی شیرینی شامل تھیں۔ وہ کہہ رہی تھی:

"رخصت، میرے حبیب! رخصت!!"

وہ دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔ لیکن میں اسی درخت کے نیچے بیٹھا رہا۔ شفقت کے ہاتھ مجھے اپنی طرف گھسیٹ رہے تھے، اور اس الجھی ہستی کے اسرار اپنی طرف۔

اس وقت میں نے سوئی ہوئی فطرت کی طرف نگاہ کی اور غور کرنے لگا، مجھے اس میں ایک ایسی چیز نظر آئی جس کی کوئی حد اور کوئی انتہا نہیں، جو دولت سے نہیں خریدی جا سکتی۔

میں نے اس میں ایک ایسی چیز پائی، جسے خزاں کے آنسو محو کر سکتے ہیں، نہ جاڑے کا ملال موت کے گھاٹ اُتار سکتا ہے، جو سوئٹزرلینڈ کے چشموں پر پائی جا سکتی ہے، نہ اطالیہ کی نزہت گاہوں میں نظر آ سکتی ہے، جو قائم و دائم ہے، بہار میں زندہ ہوتی ہے اور گرمیوں میں پھل دیتی ہے۔

میں نے اس میں "محبت" پائی۔

خواب

وہاں ـــــ سبزہ زار کے وسط میں، شفاف نہر کے کنارے، میں نے ایک پنجرہ دیکھا، جس کی تیلیوں کی بناوٹ کسی ماہرِ فن کے ہاتھوں کی رہینِ منت تھی۔ پنجرہ کے ایک گوشہ میں ایک چڑیا مری پڑی تھی؛ اور دوسرے گوشہ میں دو کٹوریاں تھیں ـــــ ایک پانی کی کٹوری، جو بالکل خشک تھی اور دوسری دانہ کی کٹوری، جس میں نام کو ایک بھی دانہ نہ تھا۔

میں ٹھہر گیا، خاموشی مجھ پر غالب آ گئی تھی۔ احساسِ ذلت کے ساتھ میں نے کان لگائے: مردہ پرندہ اور نہر کی روانی میں ایک نصیحت تھی، جو ضمیر سے کچھ دریافت کر رہی تھی اور دل سے اس کی وضاحت چاہ رہی تھی۔ میں نے سوچا اس بے چاری چڑیا نے نہر کے قریب ہوتے ہوئے پیاس کی حالت میں موت کا مقابلہ کیا، اور ان سبزہ زاروں میں رہتے ہوئے جو زندگی کا گہوارہ ہیں، بھوک نے اس کا کام تمام کر دیا، جیسے کسی سرمایہ دار کو اس کے خزانہ میں بند کر کے دروازہ مقفل کر دیا جائے اور وہ سونے کے انبار میں بھوک سے تڑپ

تڑپ کر جان دے دے!

تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا پنجرہ نے ایک دم انسانی ڈھانچہ کی شکل اختیار کر لی اور مری ہوئی چڑیا انسان کا دل بن گئی، جس میں ایک گہرا زخم ہے اور اس زخم میں سے جیتا جیتا خون بہہ رہا ہے۔ زخم کے کنارے مجھے کسی غم زدہ عورت کے ہونٹوں سے ملتے جلتے نظر آئے۔

میں نے ایک آواز سُنی، جو خون کے قطروں کے ساتھ اس زخم سے نکل رہی تھی:

"میں وہی انسان کا دل ہوں، جو مادی زنجیروں میں اسیر اور خاکی انسان کے قانونوں کا شہید ہے۔ حسن کے سبزہ زار میں زندگی کے چشموں کے کنارے میں اُن قوانین کے پنجرہ میں قید کر لیا گیا۔ جو انسان نے جذبات کے لئے وضع کئے ہیں۔ انسانی محاسن کے پنگورہ میں، محبت کے سامنے میں عالم کس پرسی میں مرگیا۔ اس لئے کہ ان محاسن کے نتیجہ اور اس محبت کے حاصل سے مجھے محروم کر دیا گیا۔ اور وہ اس طرح کہ جو کچھ میں نے چاہا عرفِ عام میں سمجھا گیا۔ جو کچھ میری تمنا ہوئی۔ انسانی فیصلوں کے مطابق ذلت قرار دی گئی۔

میں انسان کا دل ہوں، جسے سماج کی رواجی ظلمتوں میں پھنسا کر کمزور کر دیا گیا، اوہام کی زنجیروں میں جکڑ کر قریب گور پہنچا دیا گیا اور تمدنی گمراہیوں

کی پستی میں دھکیل کر مار ڈالا گیا۔

انسانیت کی زبان جکڑی ہوئی ہے اور آنکھیں پُرنم، لیکن وہ ہے کہ پھر بھی ہنس رہی ہے!!

میں نے یہ چند گلے، خون کے قطروں کے ساتھ اس زخمی دل سے نکلتے سُنے، اس کے بعد میری آنکھوں نے وہاں کوئی چیز دیکھی، نہ میرے کانوں نے کوئی آواز سُنی ——— میں بیدار ہو چکا تھا۔

حسن

"حسن حکیموں کا مذہب ہے!"
شاکر ہبزی

اے مختلف مذہبوں کی راہ میں ڈونڈرائے پھرنے والو! اور اے متضاد عقیدوں کی وادیوں میں بھٹکنے والو! تم نے کفرو الحاد کی آزادی کو تسلیم و رضا کی زنجیروں سے بہتر سمجھا اور انکار کے طلسم زاروں کو تقلید کی پناہ گاہوں کے مقابلہ میں محفوظ تر خیال کیا۔ آؤ! مذہب حسن اختیار کرو اور اسے اپنا پروردگار سمجھ کر اس سے ڈرو! اس لئے کہ حسن تمام انسانی کمالات سے نمایاں ہے اور تمام عقلی نتائج میں جلوہ گر۔ ان لوگوں کو چھوڑ کر جنھوں نے مذہب کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے اور نیک انجامی کی تمنا کا دامن مادی حرص و طمع کے دامن سے باندھ دیا ہے، حسن کی الوہیت پر ایمان لاؤ جو تمہاری پسندیدگیٔ خیات کا نقطۂ آغاز اور تمہارے شوقِ سعادت کا سرچشمہ

ہے! پھر اس سے اپنے گناہوں اور گمراہیوں کی معافی چاہو! اس لئے کہ وہ تمہارے دلوں کو عورت کی بارگاہ سے قریب کرنے والا ہے، جو تمہارے محسوسات کا آئینہ ہے اور تمہاری روحوں کو فطرت کی جولاں گاہ سے مانوس کرنے والا ہے، جو تمہاری زندگی کا مسکن ہے!

اسے قصّے کہانیوں کی رات میں خود کو برباد کرنے والو، اور اسے اوہام کے بھنور میں غرق ہونے والو حسن میں ایک حقیقت ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے، وہ ایک نور ہے، جو تمہیں باطل کی ظلمتوں میں بھٹکنے نہ دے گا۔

بہار کی بیداری اور صبح کی آمد پر غور کرو، کیونکہ حسن غور کرنے والوں کے نصیب میں ہے!

پرندوں کی چہکار، شاخوں کی سرسراہٹ اور نہروں کی روانی پر کان لگاؤ، کیونکہ حسن سننے والوں کا حصّہ ہے!

بچپن کی نرمی، نوجوانی کا جیلاپن، پختہ عمری کی قوت اور بڑھاپے کی دانائی دیکھو، کیونکہ حسن دیکھنے والوں کے لئے ایک آزمائش ہے!

نرگسی آنکھوں، گلابی رخساروں اور لالہ گوں ہونٹوں کے قصیدے پڑھو! کیونکہ مدح کرنے والوں سے حسن کو چار چاند لگتے ہیں۔

سرو قد، سیاہ بال اور ہاتھی دانت جیسی سفید گردن کی تعریف کرو،
کیونکہ حُسن تعریف کرنے والوں سے خوش ہوتا ہے۔

اپنے جسم کو حسن کا عبادت خانہ اور اپنے دل کو محبت کی قربان گاہ بنا
کر آلائشوں سے پاک کرو، کیونکہ حسن اپنے پرستاروں کو جزائے خیر دیتا ہے!
اننا کے تار بجاؤ، اے لوگو! کہ تم پر آیاتِ حسن نازل کی گئیں اور خوش
ہو جاؤ کہ تمہارے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کبھی تم غمگین ہو گے!

آتشیں حروف

میری قبر کی لوح پر کندہ کر دو:
"یہاں وہ شخص دفن ہے، جس کا نام پانی پر لکھا گیا
تھا!"
جان کیٹس

....

کیا راتیں ہم پر اسی طرح گزرتی رہیں گی؟ کیا زمانہ کے قدموں تلے ہم اسی طرح پامال ہوتے رہیں گے؟ کیا قومیں اپنی نفرتوں میں ہمیں اسی طرح پیستی رہیں گی، اور ہمارے نام کے سوا، جسے وہ روشنائی کی بجائے پانی سے کتابِ روزگار پر لکھیں گی، ہماری کوئی حفاظت نہ کریں گی؟

کیا یہ روشنی بجھ جائے گی؟ یہ محبت فنا ہو جائے گی؟ اور یہ تمنائیں مٹ جائیں گی؟

کیا موت ہر اُس چیز کو ڈھا دے گی جو ہم نے بنائی ہے؟ کیا ہوا ہر اس بات کو منتشر کر دے گی، جو ہمارے مُنہ سے نکلی ہے؟ اور کیا تاریکی

ہر اس فعل کو چھپا دے گی جو ہم سے صادر ہوتا ہے؛

کیا یہی "زندگی" ہے؛ کیا یہی "ماضی" ہے؛ جو اس طرح گزر گیا کہ اس کے نشانات بھی ہماری آنکھوں سے پوشیدہ ہو گئے! کیا یہی "حال" ہے؛ جو ماضی کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہے! اور کیا یہی "مستقبل" ہے جو "حال" یا "ماضی" ہونے بغیر بے معنی ہے!

کیا ہمارے دل کی تمام مسرتیں اور ہماری روح کے سارے غم زائل ہو جائیں گے؛ بغیر اس کے کہ ہم ان کے نتیجوں سے واقف ہوں؟

کیا انسان اسی طرح رہے گا؛ اس بلبلے کی مثال جو تھوڑی دیر کے لئے سطح سمندر پر نمودار ہوتا ہے۔ لیکن جب ہوا کے جھونکے آتے ہیں تو پھوٹ جاتا ہے ——گویا کبھی تھا ہی نہیں!

نہیں! اپنی زندگی کی قسم! کبھی نہیں!! زندگی کی حقیقت زندگی ہے وہ زندگی، جس کا آغاز رحم مادر سے ہوتا ہے، نہ خاتمہ قبر میں۔ یہ ماہ و سال اس ازلی اور ابدی حیات کے ایک لمحہ کے سوا کچھ نہیں! یہ دنیوی زندگی اپنے تمام متعلقات کے ساتھ ایک نیند ہے، اس بیداری کے ہم پہلو، جسے ہم "ڈراؤنی موت" کہتے ہیں؛ ایک ایسا خواب ہے کہ جو کچھ ہم اس میں دیکھتے اور کرتے ہیں، وہ بقائے الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے!

فضاؤں ان تمام مسکراہٹوں اور آہوں کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے،
جو ہمارے دل سے نکلتی ہیں۔ اور ان بوسوں کی آواز کو محفوظ کر لیتی ہے،
جس کا سرچشمہ محبت۔ فرشتے آنسوؤں کے ان قطروں کو نگاہ میں رکھتے
ہیں، جنہیں غم ہماری آنکھوں سے بہاتا ہے۔ اور وہ نغمے فضائے لا انتہا
میں اُڑنے والی روحوں کو سناتے ہیں۔ جنہیں فرحت ہمارے محسوسات
میں پیدا کرتی ہے۔

وہاں —— آنے والی زندگی میں —— ہم اپنے جذبات کی تمام
موجیں اور اپنے دل کی تمام جنبشیں دیکھیں گے۔ وہاں ہم اپنی اُلوہیت
کو پہچانیں گے، جسے اب یاس و نومیدی کے اثرات کی بناء پر حقارت
سے دیکھتے ہیں۔

گمراہی —— جسے آج ہم کمزوری کے نام سے پکارتے ہیں۔ کل
ہماری ہستی کا وہ حلقہ بن کر ظاہر ہوگی۔ جو انسان کے سلسلۂ زندگی کی
تکمیل کے لئے ضروری ہے۔

مشقت —— جسے اب ہم اپنی برداشت سے باہر سمجھتے ہیں،
ہمارے ساتھ زندہ رہے گی اور ہماری عظمت و بزرگی کا سبب بنے گی۔

تکلیف —— جو آج ہم بادلِ ناخواستہ سہہ رہے ہیں، کل ہمارے

لئے فخر کا تاج ہو گی۔

جان کیٹس — وہ بلبلِ خوش نوا، اگر یہ جانتا کہ اس کے نغمے انسان کے دل میں ہمیشہ محبت — حسن و جمال سے محبت — کی روح پھونکتے رہیں گے، تو کہتا:

"میری قبر پر کندہ کر دو:

یہاں اس شخص کی ہڈیاں ہیں جس کا نام
آسماں پر آتشیں حروف سے لکھا گیا ہے"

ویرانوں میں

چاند نے کھیت کیا اور "آفتاب نگر" کے آس پاس کی چراگاہوں پر ایک لطیف چادر ڈال دی۔ کائنات کی باگ ڈور سکون نے سنبھالی اور وُہ ہولناک ویرانے ایسے معلوم ہونے لگے گویا ایک قہرمانی قوت ہیں جو رات کو نازل ہونے والی بلاؤں کا مذاق اڑا رہی ہے۔

اس وقت، جیسے نیلگوں سمندر سے بخارات اُٹھتے ہیں، پردۂ عدم سے دو سائے نمودار ہوئے اور ایک عدیم المثال عمارت کے اس مرمریں ستون پر بیٹھ کر، جسے زمانہ کی گردشوں نے اُکھاڑ پھینکا تھا۔ ایک دائرہ کو غور سے دیکھنے لگے، جو طلسمی سیرگاہوں سے مشابہ تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک سائے نے سر اُٹھایا، اور ایسی آواز میں، جو دُور دراز وادیوں کی خلاؤں میں گونجنے والی آواز سے ملتی جلتی تھی، کہا: "یہ ہیں ان عمارتوں کے کھنڈر، میری محبوبہ! جو میں نے تیرے لئے بنوائی تھیں، اور یہ ہیں ان عالی شان محلوں کے بوسیدہ آثار، جنہیں میں نے

تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ اب یہ ساری عمارتیں اور یہ سارے محل مسمار ہو چکے ہیں اور ان کا صرف ایک نشان باقی رہ گیا ہے، جو قوموں کو اس عظمت کی داستان سُنا رہا ہے، جسے عام کرنے کے لئے میں نے اپنی ساری زندگی صرف کر دی اور اس اتنذار کی یاد دلا رہا ہے جسے ترقی دینے کے لئے میں نے کمزوروں اور غریبوں سے خدمت لی۔

غور سے دیکھو! میری محبوبہ! آج اس شہر پر تخریبی عناصر نے غلبہ پا لیا ہے جسے میں نے ہر طرح مستحکم کیا تھا، موجودہ نسلوں نے اس فلسفہ اور حکمت کو حقارت سے ٹھکرا دیا ہے، جسے میں عقل انسانی کا منتہا کمال سمجھتا تھا۔ انسان کی فراموش کاریوں نے اس سلطنت کو دنیا کے حافظہ سے بالکل محو کر دیا ہے، جسے میں نے چار چاند لگائے تھے اور اب میرے لئے ان لمحاتِ محبت کے سوا کچھ باقی نہیں رہا، جو تیرے حسن اور ان اثراتِ جمال کے پیدا کردہ تھے، جنہیں تیری محبت نے زندگی بخشی تھی۔

میں نے ایک گرجا عبادت کے لئے بیت المقدس میں بنوایا، جسے پادریوں نے تقدس بخشا، اور زمانہ کی گردشوں نے پیس کر رکھ دیا۔ دوسرا گرجا، محبت کے لئے میں نے اپنے پہلو میں بنایا جسے اللہ نے عزت و امتیاز سے نوازا، اور دُنیا کی کوئی قوت اس پر غالب نہ آسکی۔

میں نے اپنی ساری عمر اشیاء کی ظاہری حیثیت کے کھوج لگانے اور مادّی اعمال کی چھان بین کرنے میں گنوا دی تو لوگوں نے کہا: کتنا دانشمند ہے یہ بادشاہ! اور فرشتے بولے: کس قدر حقیر اور معمولی ہے یہ فلسفی! اس کے بعد میں نے تجھے دیکھا، میری محبوبہ! اور تیری محبت اور شوق کے گیت گانے لگا، فرشتے خوش ہو گئے، لیکن انسان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

میرا دورِ حکومت: میرے پیاسے نفس اور اس "روحِ جمیل" کے درمیان ایک پردہ تھا، جو اس کائنات میں جاری و ساری ہے، لیکن جب میں نے تجھے دیکھا تو محبت بیدار ہوئی اور اس نے اس پردہ کو چاک کر دیا۔ مجھے اپنی پچھلی زندگی پر بہت افسوس ہوا، جو میں نے دنیا کی ہر چیز کو لاعینی سمجھتے ہوئے یاس و ناامیدی کی موجوں کے حوالے کر دی تھی۔

میں نے بے شمار زرہ بکتر اور ڈھالیں تیار کرائیں اور دنیا کی مختلف قومیں میری سطوت و جبروت سے خائف ہو گئیں، پھر جب محبت نے میرے باطن کو روشن کیا تو مجھے ہر چیز، حتّیٰ کہ اپنے خاندان سے نفرت ہو گئی اور میں سب کو حقیر سمجھنے لگا۔ مگر جب موت آئی تو میں نے زرہ بکتر ڈھال، تلوار اور حکومت و سلطنت سب کو الوداع کہا اور محبت مجھے

اللہ کے حضور لے گئی۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد دوسرے سائے نے کہا:

"جس طرح پھول اپنی خوشبو اور زندگی مٹی سے حاصل کرتا ہے، اسی طرح نفس مادہ کی کمزوریوں اور کوتاہیوں سے قوت و حکمت چن لیتا ہے۔"

اس وقت دونوں سائے آپس میں گھل مل کر ایک سایہ بن گئے اور چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوا نے یہ کلمات ان مقامات میں منتشر کر دیے:

"ابدیت محبت کے سوا کسی چیز کی حفاظت
نہیں کرتی، اس لئے کہ محبت اسی کی مثال ہے۔"

ایک خواب

"وائی کاؤنٹس (س۔ ل) کے نام، اس مکرمت نامہ کے
جواب میں، جس سے انھوں نے مجھے سرفراز فرمایا!"

....

جوانی میرے سامنے سے گزری اور میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا ۔۔۔۔ دور، ایک کھیت میں پہنچ کر وہ کھڑی ہوگئی اور بادلوں اور درختوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی ۔۔۔۔ ان بادلوں کو جو خطِ شفق پر اس طرح رواں تھے گویا سفید بھیڑوں کا ایک ریوڑ ہے، اور ان درختوں کو، جو اپنی ننگی ننگی شاخوں سے بلندی کی طرف اس طرح اشارہ کر رہے تھے، گویا آسمان سے اپنے سرسبز پتوں کو واپس مانگ رہے ہیں ۔ آخر میں نے پوچھا:

"جوانی! اس وقت ہم کہاں ہیں؟"

اس نے جواب دیا:

"ہوشیار! کہ ہم حیرت کے سبزہ زاروں میں ہیں!!"

میں نے کہا:

"چلو واپس چلیں! یہاں کی تنہائی مجھے دہلا رہی ہے اور ان بادلوں اور درختوں کا نظارہ میرے دل کو تکلیف پہنچا رہا ہے!"

جواب ملا:

"صبر کرو! کہ حیرت، معرفت کا سرچشمہ ہے!!"

میں نے نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ ایک حور، سائے کی طرح ہماری طرف آرہی ہے۔ میں متحیر ہو کر چلایا:

"یہ کون ہے؟"

جوانی نے جواب دیا:

"ملپومین! جوپیٹر کی بیٹی اور غمگین کہانیوں کی دیوی[1]!"

---

[1] قدیم یونانیوں کے نزدیک فنون کی نو دیویاں (میوز) اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے ارادت مند کو اس کی محبت اور اہلیت کے مطابق اپنے عطیوں سے نوازتی تھی۔

ان دیویوں کی تفصیل یہ ہے:-

۱۔ میلپومین: غمگین کہانیوں کی دیوی ۲۔ یولیمنیا: شعر و غنا کی دیوی

۳۔ ثالیا: ہزلیات کی دیوی ۴۔ کالیوپ: فصاحت اور رزمیہ شاعری کی دیوی۔

۵۔ اراتو: غزل اور عاشقانہ شاعری کی دیوی۔ ۶۔ ترپسکوری: رقص کی دیوی۔

۷۔ اورانیا: علم الافلاک کی دیوی۔ ۸۔ کلیو: تاریخ کی دیوی۔

۹۔ ادترپی: فن موسیقی کی دیوی۔

میں نے کہا:

"غم و الم کو مجھ سے کیا واسطہ؟ جبکہ اے نشاط افزا جوانی! تو میرے پہلو میں ہے۔"

جوانی نے جواباً کہا:

"وہ نہیں دُنیا اور اس کے آلام و مصائب دکھلانے آئی ہے، اور جو شخص مصیبت و الم کو نہیں دیکھتا، وہ فرحت و سرور سے نا آشنا ئے محض رہتا ہے۔"

حور نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ دیا، اور جب ہٹایا تو میں نے اپنے تئیں جوانی سے الگ اور مادی لباس سے عاری پایا۔ میں نے اس سے پوچھا:

"اے دیوی کی لخت جگر! جوانی کہاں ہے؟"

اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا، بلکہ اپنے بازوؤں میں لپیٹ کر ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر اڑا لے گئی۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ دنیا اور اس کی ہر چیز میرے سامنے صفحہ کی طرح کھلی رکھی ہے اور اس میں رہنے بسنے والوں کے راز، لکیروں کی طرح میری نگاہ کے سامنے نمایاں ہیں۔ میں سہم کر اس حور کے پہلو میں کھڑا ہوگیا اور انسان کے بھیدوں پر غور و فکر اور زندگی کے رموز و اسرار کی تلاش و جستجو کرنے لگا۔ اس وقت جو کچھ میں

نے دیکھا، کاش نہ دیکھتا:

میں نے دیکھا: نیکی کے فرشتے بدی کے فرشتوں سے مصروفِ پیکار ہیں اور انسان، ان دونوں کے درمیان ایک ایسی حیرت میں مبتلا ہے جو کبھی تو اسے امیدوں کی طرف لے جاتی ہے اور کبھی ناامیدیوں کی طرف ——

میں نے دیکھا: محبّت اور نفرت، انسان کے دل سے کھیل رہی ہیں۔ محبّت اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کر رہی ہے اور اسے تسلیم و رضا کی شراب سے مدہوش کرکے اس کی زبان کو مدح و ستائش کے لئے کھول رہی ہے، اور نفرت اس کی دشمنی کے جذبات کو بھڑکا رہی ہے اور اسے حقیقت کی طرف سے اندھا کرکے اُس کے کانوں کو صحیح بات سننے سے روک رہی ہے —— میں نے دیکھا: آبادی ایک بھک منگی عورت کی طرح، انسان کے دامن سے چمٹی بیٹھی ہے اور حسین و خوشگوار بربادی دُور کھڑی اس کی قسمت پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہے۔

میں نے دیکھا: پادری لومڑیوں کی طرح مکر و فریب کے جال بچھا کر لوگوں کو پھانس رہے ہیں اور جھوٹے واعظ اپنی حیلہ کاریوں سے ان کے روحانی میلانات پر چھاپے مار رہے ہیں اور انسان چیخ چیخ کر عقل و حکمت سے مدد مانگ رہا ہے۔ لیکن عقل و حکمت اس کی ایک نہیں سُنتی۔ بلکہ نفرت و

غضب کے ساتھ اسے ٹھکرا دی ہے، اس بناء پر کہ جب اس نے کھلے بندوں ہر بازار، ہر گلی اور ہر کوچہ میں انسان کو پکارا، تو کسی نے اس کی آواز کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا۔

میں نے دیکھا: مذہبی اجارہ دار بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں، لیکن ان کے دل حرص وطمع کی قبروں میں مدفون ہیں —— میں نے دیکھا: نوجوان زبانوں سے محبت کے دعوے کر رہے ہیں اور اپنے بے قابو جذبات سے چمٹے ہوئے ہیں۔ لیکن اُن کی "اُلوہیت" اُن سے کوسوں دُور ہے، اور ان کے جذبات، محوِ خواب —— میں نے دیکھا خداوندانِ قانون، مکر و فریب کے بازار میں اپنی چرب زبانی سے باقاعدہ تجارت کر رہے ہیں اور طبیب سادہ لوح معتقدین کی روحوں سے کھیل رہے ہیں —— میں نے دیکھا، جاہل، عقل مند کی صحبت میں بیٹھا ہے اور اپنے ماضی کو عظمت و اقتدار کی بلندیوں پر پہنچا رہا ہے، اپنے حال کو بے فکری و فراخ دستی کی مسند کا تکیہ بنا رہا ہے اور اپنے مستقبل کے لئے شان و شوکت کے فرش بچھا رہا ہے —— میں نے دیکھا: مفلس و فاقہ کش بو رہے ہیں اور طاقت ور دولت مند ان کی محنتوں سے مزے اُڑا رہے ہیں اور اس ظلم کا نام لوگوں نے قانون رکھا ہے —— میں نے دیکھا: تاریکی میں چوری کرنے والے

عقل کے خزانوں کو لوٹ رہے ہیں اور روشنی کے چوکیدار، سستی اور کاہلی کی چادر میں لپیٹے پڑے سو رہے ہیں ـــــ میں نے دیکھا: عورت ایک رباب کی طرح اس مرد کے ہاتھ میں ہے جو نہیں جانتا کہ تار پر مضراب کس طرح رکھی جاتی ہے ـ اس لئے جو نغمے اس سے نکلتے ہیں، ناپسندیدہ اور ناگوار ہوتے ہیں ـــــ میں نے دیکھا: نام نہاد شریفوں کی فوج نے موروثی شرافت کے شہر کا محاصرہ کر رکھا ہے اور اصل نسل شریف زادہ اپنی اقلیت و نااتفاقی کی بنا پر ان کے مقابلہ میں پسپا ہو رہا ہے ـــــ میں نے دیکھا: حقیقی آزادی تنہا بازاروں میں ماری ماری پھر رہی ہے ـ وہ ہر دروازہ پر جا کر سر چھپانے کی جگہ چاہتی ہے لیکن لوگ اسے دھتکار دیتے ہیں، اس کے برخلاف رذالت کمینگی، ایک عظیم الشان جلوس کی شکل میں رواں ہے اور لوگ اسے "آزادی" کہہ رہے ہیں ـ میں نے دیکھا: مذہب کتاب کی تہوں میں دفن ہے اور وہم نے اس کی جگہ لے رکھی ہے ـــــ میں نے دیکھا: انسان نے بزدلی کو صبر کا لباس پہنا رکھا ہے، کاہلی کو استقلال کا لقب دے رکھا ہے اور خوف کو مہربانی کے نام سے موسوم کر رکھا ہے ـــــ میں نے دیکھا: تہذیب و شائستگی کے دستر خوان پر "طفیلئے" قبضہ کئے بیٹھے ہیں اور حقیقی مہمان خاموش ہے ـــــ میں نے دیکھا، عشرت و عیاش کے ہاتھ میں دولت اس کی بدمعاشیوں کا

جال ہے اور بخیل و کنجوس کے ہاتھ میں لوگوں کی بدبختی کا آلہ ۔ لیکن عقلمند کا ہاتھ مال و دولت سے بالکل خالی ہے ۔

جب یہ سب کچھ میں نے دیکھ لیا تو اس منظر کی تاب نہ لا کر شدتِ الم سے چلا اُٹھا :

" اے دیوی کی نورِ نظر! کیا یہی دُنیا ہے ؟ کیا یہی انسان ہے ؟ "

ایک جراحت کار خاموشی کے ساتھ اس نے جواب دیا :

" یہ کانٹوں اور کیڑوں سے پٹی ہوئی روح کی راہ ہے! یہ انسان کا سایہ ہے!! یہ رات ہے!!! جس کی صبح ہونے والی ہے ۔ "

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھا اور جب ہٹایا تو میں نے دیکھا کہ میں اور شباب آہستہ آہستہ جا رہے ہیں اور امیدیں ہمارے سامنے ناچ رہی ہیں ۔

کل اور آج

دولت مند اپنے محل کے پائیں باغ میں نکلا، غم اس کے پیچھے پیچھے تھا اور اضطراب اس کے سر پر اس طرح منڈلا رہا تھا، جیسے موت کے پھیلے ہوئے جسم پر گدھ منڈلاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ایک تالاب کے پاس پہنچا جس کے بنانے میں دستِ انسانی نے اپنی مہارت کے جوہر دکھائے تھے اور جس کے کناروں پر سنگِ مرمر کی تراشی ہوئی سلیں لگائی گئی تھیں، یہاں دولتمند بیٹھ گیا۔ وہ کبھی اس پانی کو دیکھتا تھا جو سنگین مورتیوں کے منہ سے اس طرح اُبل رہا تھا، جیسے شاعر کی تخیل سے خیالات اُبلتے ہیں اور کبھی اپنے حسین محل کو، جو اس چھوٹی سی پہاڑی پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی دوشیزہ کے رخسار پہ سیاہ تل۔

وہ بیٹھا تھا کہ ایک "یاد" آکر اس کے پہلو میں بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہ صفحات کھول کر رکھ دیے، جنہیں ماضی کے قلم نے اس کی داستانِ حیات کے سلسلہ میں لکھا تھا۔ اس نے ان صفحات کو پڑھنا شروع کیا۔

آنسوؤں نے اس کی نگاہوں سے اس تالاب کو چھپادیا، جو انسان کے صنعتی کمالات کا مظہر تھا اور رنج وغم نے اس کے دل میں ان دنوں کے نقوش تازہ کردیے جنہیں دیوتاؤں نے دل آویزی و دلکشی عطا کی تھی۔ شدتِ الم سے بے تاب ہوکر اس نے کہنا شروع کیا:

"کل تک میں ان سرسبز چراگاہوں میں بھیڑ بکریاں چراتا اور مگن زندگی بسر کرتا تھا۔ اپنی مسرتوں کے اظہار سے اپنی جوانی میں کیف و سرور کی روح پھونکتا تھا، لیکن، آہ! آج میں حرص وطمع کا غلام ہوں۔ لالچ مجھے دولت کی طرف کھینچتا ہے۔ دولت، انہماک کی طرف اور انہماک بدبختی کی طرف، کل تک میں ایک چہچہاتی ہوئی چڑیا اور ایک ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر اڑنے والی رنگین تتلی تھا۔ ان سبزہ زاروں میں گھاس پر میرے قدم نسیم سحر سے بھی زیادہ نرم ولطیف تھے۔ لیکن افسوس! آج میں سماجی رسم ورواج کا اسیر ہوں۔ انسان کی خواہشوں اور اس کے قوانین کے احترام میں میں اپنے لباس، اپنی غذا اور اپنے ہر فعل میں تصنع اور نمائش سے کام لیتا ہوں۔ کل تک میری تمنا تھی کہ اگر میں دُنیا میں آیا ہوں تو مجھے مستی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔ لیکن آج میں اپنے تئیں مال و دولت کی بنا پر غم کے راستوں پر چلتا ہوا دیکھ رہا ہوں، میں خود کو اس اونٹنی کی مثال پا رہا ہوں، جو سونے کے بوجھ سے دبی اور مری جارہی ہو—

کہاں ہیں وہ وسیع میدان؟ کہاں ہیں وہ گاتی ہوئی نہریں؟ کہاں ہے وہ پاک صاف ہَوا؟ کہاں ہے وہ قطرت کا جلال؟ اور کہاں ہے وہ میری الوہیت؟ آہ! یہ سب کچھ میں نے کھو دیا! اور اب میرے لیے کوئی چیز باقی نہیں رہی، سوائے اُس "سونے" کے جس کی میں پرستش کرتا ہوں اور وہ میرا مذاق اڑاتا ہے، سوائے ان غلاموں کے جن کی کثرت میری مسرتوں میں کمی کا باعث ہوئی اور سوائے اس محل کے جسے میں نے تعمیر کرایا تو میری خوشی فنا ہوگئی۔ کل تک میں اور ایک خانہ بدوش لڑکی، یہاں سیر کرتے پھرتے تھے۔ عفّت ہماری محافظ، محبت ہماری ندیم اور چاند ہمارا رقیب تھا۔ لیکن آج میں ان عورتوں میں گھرا ہُوا ہوں؛ جو گردنیں اُٹھا کر آنکھیں مٹکاتی پھرتی ہیں۔ پاؤں اور گردن کے زیوروں کے بدلے اپنا حُسن اور چوڑیوں اور انگوٹھیوں کے بدلے اپنی عصمت بیچتی پھرتی ہیں۔ کل تک میں اور میرے دوسرے نوجوان ساتھی ہرنوں کی ڈار کی طرح درختوں میں چوکڑیاں بھرتے، عیش و بے فکری کے گیت گاتے اور سبزہ زاروں کی لطافتوں سے خوش کلام ہوتے تھے، لیکن آج میں لوگوں میں ایسا معلوم ہوتا ہوں۔ جیسے بھیڑیوں میں بھیڑ۔ جب کبھی بازار جاتا ہوں، دشمنی کی نگاہیں مجھ پر پڑتی ہیں اور حسد کی نگاہیں میری طرف اٹھتی ہیں۔ سیرگاہوں میں دیکھتا ہوں تو چڑھی ہوئی تیوریوں اور اینٹھی ہوئی گردنوں کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں

آتا۔ کل تک میں زندگی اور حسنِ فطرت سے لطف حاصل کرتا تھا۔ لیکن آج یہ دونوں چیزیں مجھ سے چھین لی گئیں۔ کل تک میں اپنی نیک بختی سے مالا مال تھا۔ لیکن آج اپنے مال و دولت کے ہاتھوں فقیر ہوں، کل تک میں ایک رحم دل بادشاہ تھا اور میری بھیڑ بکریاں وفادار رعایا۔ لیکن آج میں ایک سنگدل غلام ہوں اور میرے طلائی انبار مظلوم آقا ۔۔۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی، کہ دولت میری چشمِ بصیرت کو اندھا کر کے میرے دل کو جہالت کے گڑھوں میں پھینک دے گی۔ اور نہ میں اس حقیقت کو جانتا تھا کہ جس چیز کو دُنیا "عظمت" "بزرگی" سمجھتی ہے۔ صد حیف! وہ جہنم سے زیادہ آتش ناک ہے۔"

دولت مند اپنی جگہ سے اُٹھا اور ٹھنڈے سانس بھرتا، آہستہ آہستہ اپنے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ بار بار اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔

"کیا دولت یہی ہے؟ کیا یہی وہ "دیوتا" ہے۔ جس کی میں پوجا کرتا ہوں! کیا یہی وہ چیز ہے، جسے ہم زندگی کے بدلے خریدتے ہیں اور وہ اتنے کام کی بھی نہیں کہ اس کے ذریعہ ہم زندگی میں ذرہ برابر ہی تبدیل کر لیں؟

کوئی ہے، جو طلائی اینٹوں کے بدلے اپنی لطیف فکر میرے ہاتھ فروخت کر دے؟ کوئی ہے جو مٹھی بھر جواہر کے عوض مجھے تھوڑی سی محبت دے دے؟ کوئی ہے، جو میرے سارے خزانے لے لے اور مجھے وہ آنکھ عطا کر

دے جو حسن آشنا ہے۔"

محل کے دروازہ پر پہنچ کر اس نے شہر کی طرف دیکھا، جس طرح اچھوتی مریم، نے بیت المقدس کو دیکھا تھا اور اپنے ہاتھ سے اس کی طرف اس طرح اشارہ کر کے، گویا اس پہ ماتم کر رہا ہے، بلند آواز میں کہنے لگا ۔

"اے تاریک راہوں میں ٹھوکریں کھانے والو! اے موت کے سائے میں آرام سے بیٹھنے والو! اے بدبختی کے پیچھے دوڑنے والو! اے باطل کے حق میں فیصلے کرنے والو! اور اے حماقت و نادانی کے پتلو! آخر تم کب تک پھول اور پھلوں کو جہنم میں پھینکتے اور کانٹے کھاتے رہو گے ؟ آخر تم کب تک فردوس زندگی کو چھوڑ کر ویرانوں اور جنگلوں میں پڑے رہو گے ؟ تم نے اپنے جسم پر چیتھڑے کیوں لگا رکھے ہیں ؟ جبکہ ریشمیں اور نفیس کپڑے تمہارے لئے موجود ہیں !

اے بدقسمت قوم ! فلسفہ و حکمت کا چراغ بجھا چاہتا ہے، اس میں تیل ڈالو! راہرو نے نیک بختی کی کیاری کو پامال کر دیا ہے، اس کی نگرانی کرو چور نے تیری راحت کے خزانے پر ڈاکہ مار دیا ہے، ہوشیار ہو!"

اس وقت ایک فقیر اس کے سامنے آ کر کھڑا ہوا اور دستِ سوال دراز کیا۔ دولت مند نے اس کی طرف دیکھا، اس کے لرزیدہ ہونٹ آپس میں مل گئے، غمگین چہرہ پر شگفتگی کے آثار نمایاں ہو گئے اور آنکھوں سے ایک لطیف روشنی

پھوٹ نکلی! گویا "کل" جس پر وہ تالاب کے کنارے بیٹھا ماتم کر رہا تھا، صحیح و سالم واپس آگیا ہے۔ وہ فقیر کے پاس گیا اور محبت و مساوات کے جذبہ کے زیر اثر اس کی پیشانی چوم کر اس کی مٹھیاں زر و جواہر سے بھر دیں، پھر کہا، اس طرح کہ شفقت اس کے الفاظ سے ٹپکی پڑ رہی تھی۔

"لو، بھائی! اس وقت تو یہ لے جاؤ، اور کل اپنے ساتھیوں کے ساتھ آکر اپنا سارا مال واپس لے جانا!"

فقیر مسکرایا، اس مرجھائے ہوئے پھول کی طرح جو بارش سے محروم ہو، اور خوشی خوشی واپس چلا گیا۔

اب دولت مند بھی اٹھا اور اپنے دل ہی دل میں یہ کہتا ہوا محل میں داخل ہو گیا۔

"زندگی کی ہر چیز حسین ہے، یہاں تک کہ دولت بھی! کیونکہ انسان اس سے ایک سبق حاصل کرتا ہے — دولت اس ارغنوں کی مثال ہے جو کسی ناآشنا کے ہاتھ میں ہو تو اس سے ناخوشگوار نغمے نکلتے ہیں — دولت محبت کی مثال ہے، جو بخل سے کام لیتا ہے، وہ فنا کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ اور جو بذل و کرم کو اختیار کرتا ہے۔ وہ زندۂ جاوید ہو جاتا ہے۔"

رحم اے نفس، رحم!!

کب تک نالہ و ماتم کرتا رہے گا؟ اے نفس! جبکہ تو میری کمزوری سے واقف ہے، آخر کب تک چیخ پکار مچاتا رہے گا؟ جبکہ میرے پاس صرف انسانی کلام ہے، جس کے ذریعہ میں تیرے تصورات کی ترجمانی کرتا ہوں!

دیکھ، اے نفس! کہ میں نے اپنی ساری عمر تیرے احکام و ہدایات کی تعمیل میں گزار دی، اور غور کر اے مجھے تکلیف و عذاب میں مبتلا کرنے والے! کہ میں نے اپنا جسم تیرے نقش قدم پر چلنے میں تباہ کر لیا۔

میرا دل، میرا بادشاہ تھا لیکن اب تیرا غلام ہے۔ میرا صبر، میرا مونس و ہمدرد تھا لیکن اب تیرے ساتھ مجھے برا بھلا کہہ رہا ہے۔ میرا شباب، میرا ندیم تھا لیکن آج وہ مجھ پر لعنت ملامت کر رہا ہے۔ آہ! یہ سب کچھ وہ تھا۔ جو مجھے دیوتاؤں کی طرف سے عطا کیا گیا تھا! پھر تو مجھ سے اور کیا چاہتا ہے اور اس سے زیادہ تجھے کس چیز کی طمع ہے؟

میں نے اپنی ذات سے انکار کر دیا۔ اپنی زندگی کی پناہ گاہوں کو چھوڑ دیا

اپنی ساری عمر کی عظمتوں کو خاک میں ملادیا اور اب میرے لئے تیرے سوا، کچھ باقی نہیں رہا، اس لئے تجھے چاہئے کہ میرے ساتھ عدل و انصاف سے کام لے، کیونکہ عادل و انصاف ہی تیری عظمت و بزرگی کا سرمایہ ہے، یا پھر موت کو آواز دے اور اپنے شکار کو اس قید و بند سے نجات دلا!!

اے نفس! رحم! کہ تو نے مجھ پر محبت کا وہ بار ڈال دیا، جسے برداشت کرنا میرے امکان سے باہر ہے۔ تو اور محبت دو متحد قوتیں ہیں اور میں اور مادہ دو منتشر کمزوریاں! پھر قوی اور ضعیف میں جنگ کب تک جاری رہ سکتی ہے۔

اے نفس! رحم! کہ تو نے مجھے دُور سے سعادت کا جلوہ دکھا کر بے چین کر دیا۔ تو اور سعادت ایک بلند پہاڑ پر ہیں اور میں اور بدبختی وادی کی اتھاہ گہرائیوں میں۔ پھر بلندی و پستی میں ملاقات کی تکمیل کیسے ہو سکتی ہے؟

اے نفس! رحم، کہ تو نے مجھے حسن کی ایک جھلک دکھائی اور چھپالی۔ تو اور حسن روشنی میں ہیں اور میں اور جہالت تاریکی میں پھر روشنی تاریکی سے کیسے مل سکتی ہے؟

تو، اے نفس! آخرت کی آمد سے پہلے ہی اس سے فرحت اندوز ہے اور یہ جسم زندگی کی آغوش میں ہوتے ہوئے اس کے ہاتھوں مصیبت میں گرفتار!

تو، نہایت تیزی سے ابدیت کی طرف گامزن ہے اور یہ جسم آہستہ آہستہ فنا کی سمت۔ تو اپنی رفتار سست کر سکتا ہے۔ نہ جسم اپنی رفتار تیز۔ اور یہ اے نفس! بدقسمتی کی انتہا ہے!

تو، آسمان کی کشش کے زیر اثر، بلندیوں پر چڑھ رہا ہے اور یہ جسم، زمین کی کشش کے زیر اثر، تحت الثریٰ میں اتر رہا ہے۔ تو اس پر اظہار افسوس کر سکتا ہے اور نہ وہ تجھے مبارک باد دے سکتا ہے اور یہی نفرت کی انتہائی حد ہے!

تو، اے نفس! اپنی عقل و حکمت کی بنا پر بے نیاز ہے اور یہ جسم اپنی فطرت کی وجہ سے محتاج۔ تو اس کے ساتھ مروّت کا سلوک کر سکتا ہے اور نہ وہ تیری تقلید۔ اور یہ انتہائی بدبختی ہے، جس کا تصور کیا جا سکتا ہے!

تو رات کے سکون میں اپنے محبوب کی طرف جا رہا ہے اور اس سے ہم آغوش و ہم کنار ہو کر شاد کام ہوگا، لیکن یہ جسم ابدالآباد تک شوق اور جدائی کا مارا رہے گا۔

رحم، اے نفس، رحم!!

بیوہ اور اس کا بیٹا

دن پر غالب آنے کے لیے، جس میں وادی قادیشا[1] کے آس پاس کے گاؤں میں مسلسل برف باری ہوتی رہی تھی۔ رات نے نہایت تیزی سے حملہ کر دیا، اور کھیتوں اور پہاڑیوں کو ایک سفید و سادہ صفحہ بنا دیا، جس پر ہوا پہلے پہلے کچھ لکھتی اور مٹا دیتی تھی جس سے آندھیوں کے جھکڑ غضبناک فضا کو دہشت انگیز نظارے پیش کرتے ہوئے کھیل رہے تھے۔

انسان مکانوں میں جا چھپے تھے، اور مویشی باڑوں میں، ہر ذی حیات حرکت و عمل سے عاجز تھا اور سوائے خلش آفریں سردی، بے پناہ خنکی، خوفناک و سیاہ رات اور ہولناک و طاقت ور موت کے کچھ باقی نہ رہا تھا۔

---

[1] وادی قادیشا، یعنی مقدس لوگوں کی وادی، اس نام سے اس لیے موسوم ہے کہ زاہدوں کا، علماء اور ان تجرد پسندوں کا مادیٰ ہے جو دنیا کی بدبختیوں اور سماج کے ہنگاموں سے اکتا کر بھاگ گئے ہیں۔ یہاں انہیں ایک عام مسکن اور وہ غار با آسانی مل جاتے ہیں جنہیں دست قدرت نے زمین کا سینہ چیر کر بنایا ہے۔ یہ وادی اس قدر گہری ہے کہ اگر سورج کی شعاعیں چاہیں بھی تو یک وقت اس کی پہنائیوں کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ اسے لبنان کے سینہ کا گہرا زخم سمجھنا چاہیے۔ وہ گہرا زخم، جو نہایت گہری دوستی کے بعد زمانہ کے ہاتھوں اسے پہنچا۔

گاؤں کی آبادی سے الگ، ایک تنہا مکان میں ایک عورت انگیٹھی کے سامنے بیٹھی اپنی چادر بن رہی تھی۔ پہلو میں اس کا اکلوتا بچہ تھا، جو کبھی آگ کے شعلوں کو دیکھتا تھا اور کبھی اپنی ماں کے پرسکون چہرہ کو یکایک آندھی تیز ہو گئی اور مکان کے در و دیوار لرزنے لگے۔ بچہ ڈر کر اپنی ماں سے اور قریب ہو گیا، تاکہ اس کی آغوش شفقت میں عناصر کی غضب ناکی سے محفوظ ہو جائے۔ ماں نے اسے اپنے سینہ سے چمٹا کر پیار کیا اور اپنے گھٹنوں پر بٹھا کر کہنے لگی:

"بیٹا! ڈرو نہیں، فطرت انسان کو اس کی بے بضاعتی کے مقابلہ میں اپنی عظمت اور اس کی کمزوری کے مقابلہ میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرکے نصیحت کرنا چاہتی ہے۔ نہ ڈر، میرے بچے! کہ زمین پر گری ہوئی برف، آسمان پر چھائے ہوئے بادل اور فضا کو تلپٹ کر دینے والی آندھی کے جھکڑوں کے پس پردہ ایک عام اور برگزیدہ روح ہے۔ جو میدانوں اور پہاڑوں کی ضروریات کو جانتی ہے ہر چیز کے پس پردہ ایک روزن ہے، جس میں سے یہ روح انسان کی بے بضاعتی کو بہ نگاہ رحمت و شفقت دیکھتی ہے۔ خوف نہ کھا میرے کلیجہ کے ٹکڑے! کہ فطرت، جو بہار میں مسکراتی گرمیوں میں قہقہے لگاتی اور خزاں میں آہیں بھرتی ہے۔ اب رونا چاہتی ہے تاکہ زمین کے انتہائی طبقہ میں پڑی ہوئی زندگی اس کے سرد آنسوؤں سے اپنی پیاس بجھالے۔ میرے بچے! سو جا! کل جب تو بیدار ہوگا تو آسمان کو صاف اور میدانوں کو

برف کی سفید چادر اوڑھے دیکھے گا - جس طرح موت سے مقابلہ کے بعد روح پاکیزگی کا لباس پہن لیتی ہے - سوجا! میرے اکلوتے بچے تیرا باپ اس وقت ہمیں ابدیت کی نزہت گاہوں سے دیکھ رہا ہے - مبارک ہے وہ آندھی اور وہ برف باری، جو ہمیں ان غیر فانی روحوں کی یاد سے ہم آغوش کردے! میرے پیارے، سوجا، بہار آنے پہ تو انہیں عناصر سے جو آج نہایت شدت سے آپس میں دست وگریباں ہیں خوبصورت پھول توڑے گا۔ جس طرح انسان الم ناک دوری، حوصلہ فرسا صبر اور ہلاکت خیز مایوسی کے بعد پھل پاتا ہے میری آنکھوں کے نور سوجا! کہ شیریں خواب، رات کی ہیبت اور سردی کی شدت سے بے خوف ہوکر تجھ تک آئیں گے۔"

بچہ نے اپنی ماں کی طرف دیکھا، نیند نے اس کی آنکھوں کو سرمگیں بنادیا تھا - وہ کہنے لگا :-

"اماں! نیند نے میری پلکوں کو بوجھل بنادیا ہے - مجھے ڈر ہے کہیں میں صبح کی نماز پڑھنے سے پہلے ہی نہ سو جاؤں۔"

مہربان ماں نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور اشک آلود آنکھوں سے اس کے چہرہ کو دیکھنے لگی جس پر فرشتوں کی معصومیت کھیل رہی تھی، اس نے کہا "میرے بچے! میرے ساتھ دعا مانگ - یارب فقیروں پر رحم کر! انہیں پناہ دے

کی سنگ دلی سے بچا! اور ان کے عریاں جسموں کو اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ!!!
جھونپڑوں میں سوئے ہوئے یتیموں اور برف کی تیز انگلی کو دیکھ! جو ان کے جسموں کو چھید ڈالتی ہے!

یارب! بیواؤں کی فریاد سن! جو سڑکوں پر موت کے چنگل اور سردی کے پنجوں میں گھری کھڑی ہیں۔

یارب! اپنا ہاتھ سرمایہ دار کے دل کی طرف بڑھا، اور اس کی چشم بصیرت کو وا کر! تاکہ وہ کمزوروں اور مظلوموں کی تباہ حالی دیکھ سکیں!

یارب! ان بھوکوں پر مہربانی فرما! جو اس تیرہ و تار رات میں دروازوں کے سامنے کھڑے ہیں اور پردیسیوں کی غریب الوطنی پر رحم کھا کر گرم مسکنوں کی طرف انکی رہنمائی کر!

یارب! چھوٹی چھوٹی چڑیوں کی طرف دیکھ! اور اپنے دائیں ہاتھ سے ان درختوں کی حفاظت کر! جو ہوا کی تندی سے خائف ہیں۔

یارب! ایسا ہی کر کہ تجھ میں سب قدرت ہے!"

جب نیند بچہ سے ہم آغوش ہو گئی تو ماں نے اسے اس کے بستر پر لٹا دیا اور کانپتے ہونٹوں سے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ اس کے بعد لوٹی اور انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر اس کے لیئے اونی چادر بننے لگی۔

زمانہ اور قوم

لُبنان کے دامن میں نہر کے کنارے — جو چٹانوں میں بہتی ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے چاندی کے تار — ایک بھیڑیں چرانے والی بیٹھی تھی۔ اس کے چاروں طرف سوکھی دُبلی بھیڑوں کا ریوڑ تھا، جو تازہ کانٹوں کے درمیان سوکھی گھاس چر رہا تھا — یہ نوخیز لڑکی دُور افق کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گویا فضا کے صفحات پر مستقبل کے واقعات کا مطالعہ کر رہی ہے۔ آنسو اس کی آنکھوں میں اس طرح چمک رہے تھے، جیسے نرگس کے پھولوں پر شبنم کے قطرے چمکتے ہیں اور مایوسی نے اس کے لبوں کو اس طرح وا کر دیا تھا، گویا اس کے دل کو آہوں میں تبدیل کر کے سلب کر لینا چاہتی ہے۔

جب شام ہوئی اور ٹیلے سائے کی چادر اوڑھنے لگے تو اچانک ایک بوڑھا اس نوجوان لڑکی کے سامنے آ کھڑا ہُوا، جس کے سفید بال سینہ اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے، اور سیدھے ہاتھ میں ایک تیز درانتی تھی۔ ایسے لہجہ میں جو موجوں کی گڑگڑاہٹ سے مشابہ تھا۔ اس نے کہا:

"سلام! اے سیریا!"
لڑکی سہم کر کھڑی ہو گئی اور ایسی آواز میں جسے خوف منقطع کر رہا تھا اور ادا سی مربوط، اس نے کہا:۔
"زمانہ! تو مجھ سے کیا چاہتا ہے"؟
یہ کہہ کر اپنی بھیڑوں کی طرف اشارہ کیا اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولی:۔
"جن بھیڑوں سے کبھی وادی بھری رہتی تھی، اب ان میں سے صرف یہ باقی ہیں، بس یہی ہیں وہ بھیڑیں، جو تیرے دندانِ حرص و آز سے بچ گئی تھیں، تو کیا تو ان میں سے کچھ اور بھیڑیں چاہتا ہے؟
یہی ہیں وہ چراگاہیں، جنھیں میں تیرے قدموں سے پامال دیکھ رہی ہوں حالانکہ یہی چراگاہیں کبھی سرسبز و شادابی اور وسائل معاش کا سرچشمہ تھیں۔ میری بھیڑیں ان میں پھول کھاتی تھیں اور پاک و صاف دودھ دیتی تھیں۔ لیکن اب انہیں بھیڑیوں کو دیکھ، ان کے پیٹ خالی ہیں اور یہ موت سے بچنے کے لئے کانٹے اور درختوں کی جڑیں چبا رہی ہیں۔
زمانہ! خدا سے ڈر، اور میری آنکھوں سے دُور ہو جا! تیرے مظالم کی یاد نے مجھے زندگی سے بیزار کر دیا ہے، اور تیری درانتی کی تیزی کے سبب میں موت

سے محبت کرنے لگی ہوں۔

مجھے تنہا چھوڑ دے! تاکہ میں آنسوؤں کی شراب پیتی رہوں اور نسیم غم کی موجوں میں سانس لیتی رہوں۔

جا! اے زمانہ! مغرب میں جا!! جہاں لوگ زندگی کی مسرتوں سے شادکام ہیں اور مجھے ان بربادیوں پر ماتم کرنے کے لیے چھوڑ دے جو تیرے صدقہ میں ہم پر نازل ہوئی ہیں۔

بوڑھے نے باپ کی سی شفقت سے اس کی طرف دیکھا اور درانتی اپنے کپڑوں میں چھپا کر بولا۔

"میری بیٹی! میں نے جو کچھ تجھ سے لیا ہے، وہ میری ہی بخشش و عطا کا ایک حصہ ہے۔ میں غارت گر ہرگز نہیں ہوں، جو کچھ کسی سے لیتا ہوں مستعار لیتا ہوں اور جوں کا توں واپس کر دیتا ہوں تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ دوسری قوموں نے جو تیری ہی بہنیں ہیں جو کچھ حاصل کیا ہے اسی عہد درشت کی خدمت سے حاصل کیا ہے، جو کبھی تیرے غلام تھے انہوں نے اپنا حق وہی چادر اوڑھ کر حاصل کیا ہے جو کبھی تیرے لئے تھی۔ میں اور انصاف ایک ہی ذات کے دو جوہر ہیں۔ اس لئے مجھے زیب نہیں دیتا کہ میں تیری اور بہنوں کو وہ نہ دوں جو تجھے عطا کیا تھا۔ اور نہ میں اس پر قادر ہوں کہ اپنی محبت

میں جانبداری سے کام لوں اس لیئے کہ محبت کی تقسیم تو از روئے انصاف ہی ہوتی ہے۔

سیبریا! تجھے اپنے ہمسایہ ممالک ـــــ مصر، ایران اور یونان سے سبق لینا چاہیے کہ ان کی بھیڑیں بھی تیری بھیڑوں کی طرح سوکھی دُبلی اور ان کی چراگاہیں بھی تیری چراگاہوں کی طرح بے آب و گیاہ ہیں۔

سیبریا! جسے تو انحطاط و زوال سے تعبیر کر رہی ہے میں اسے ضروری نیند سمجھتا اور کہتا ہوں۔ جس کے نتیجہ میں حرکت و عمل کی عشرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ پھول حیاتِ تازہ سے ہم کنار نہیں ہوتا جب تک موت سے ہم آغوش نہ ہو اور محبت عظمت کے اوج کمال پر نہیں پہنچتی جب تک فراق و ہجر کی تنگ و تاریک گھاٹیاں طے نہ کرے"!

بوڑھا، نوجوان لڑکی سے اور قریب ہو گیا اور اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا:۔

"اے پیغمبروں کی بیٹی! مجھ سے ہاتھ ملا"!

نوجوان لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اشک آلود آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی:

الوداع! اے زمانہ! الوداع!!

زمانہ نے جواب دیا:

"رخصت اے سیریا! پھر کبھی ملیں گے!!

زمانہ روپوش ہوگیا، جس طرح بجلی چھپ جاتی ہے۔ لڑکی نے اپنی بھیڑوں کو پکارا اور ان کے آگے دل ہی دل میں یہ فقرہ دہراتی چلنے لگی۔

"کیا پھر ملاقات ہوگی؟ کیا پھر ملاقات ہوسکتی ہے؟!"

بارگاہِ جمال میں

میں اجتماعی زندگی سے بھاگا اور وسیع وادی میں بھٹکنے لگا۔ کبھی تو میں نہروں کے کنارے کنارے چلنے لگتا اور کبھی پرندوں کی چہکار سننے لگتا۔ یہاں تک کہ ایسی جگہ پہنچا جسے گھنے درختوں نے سورج کی نگاہوں سے محفوظ کر رکھا تھا۔ وہاں بیٹھ کر میں اپنی تنہائی سے باتیں اور روح سے سرگوشیاں کرنے لگا —— اس پیاسی روح سے جس نے جہاں نظر ڈالی، اس شے کو دیکھا جو شراب[1] نہیں سراب نظر آتی ہے۔

جب میرا ذہن مادّی قیود سے آزاد ہو کر فضائے خیال میں پرواز کرنے لگا تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا ایک نوخیز حسینہ میرے پاس کھڑی تھی۔ وہ نوخیز حسینہ، جو انگور کی شاخوں کے سوا —— جن سے اس کے جسم کا کچھ حصّہ چھُپ گیا تھا —— ہر قسم کے لباس اور زیور سے بے نیاز تھی۔ جس کے سنہری بالوں کو گلِ لالہ کے تاج نے سمیٹ رکھا تھا۔

[1] یہاں شراب سے وہ شراب مراد نہیں جو نشہ آور ہے بلکہ ہر وہ چیز مراد ہے جو پی جاتی ہے (مترجم)

جب اسے میری نگاہوں سے یہ معلوم ہُوا کہ میں حیرت کا شکار ہوں تو بولی:-

"ڈرو نہیں! میں جنگل کی شہزادی ہوں!"

اس کے لہجہ کی شیرینی نے مجھ میں کچھ ہمت پیدا کی اور میں نے کہا:

"کیا تم جیسی حسین شخصیت جنگل میں رہ سکتی ہے، جو تنہائی اور درندوں کا مسکن ہے؟ تمہیں اپنی زندگی کا واسطہ، مجھے سچ سچ بتاؤ! تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟"

وہ گھاس پر بیٹھ گئی اور کہا:-

"میں فطرت کا راز ہوں! میں وہ دوشیزہ ہوں جس کی پرستش تمہارے آباؤ اجداد کرتے تھے اور جس کے لئے انہوں نے بعلبک، افقا اور جبلیل میں ہیکل اور قربان گاہیں بنائیں"

میں نے کہا:-

"وہ ہیکل مسمار ہوگئے اور میرے اجداد کی ہڈیاں مٹی میں مل گئیں اب ان کے دیوتاؤں اور مذاہب کے نشانات کتابوں کے چند اوراق میں باقی رہ گئے ہیں اور بس!"

اس نے جواب دیا:-

"کچھ دیوتا ایسے ہیں، جو اپنے حلقہ بگوشوں کے ساتھ زندہ رہتے اور انہیں کے ساتھ مرجاتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو ازلی و ابدی الوہیت کے ساتھ زندہ رہتے ہیں۔ رہی میری الوہیت، سو وہ اس جمال کی مرہون ہے' جسے تو ہر طرف جلوہ فرما دیکھتا ہے۔۔ وہ جمال جو تمام فطرت ہے، جو ٹیلوں کے درمیان چرواہے کے لئے کھیتوں کے درمیان کاشتکار کے لئے اور پہاڑوں اور ساحلوں کے درمیان خانہ بدوش قبائل کے لئے سعادت کا سرچشمہ ہے وہ جمال جو کلیم کے لئے عرشِ حقیقت کا زینہ ہے"!

ایسی حالت میں کہ میرے دل کی دھڑکنیں وہ کچھ کہہ رہی تھیں، جس سے زبان ناآشنا لئے محتق ہے، میں نے کہا:۔

"بے شک جمال ایک قوت ہے، خوفناک اور ڈراؤنی"!

اس کے ہونٹوں پر پھولوں کا تبسم تھا اور نگاہوں میں زندگی کے اسرار اس نے کہا:۔

تم انسان ہر چیز سے ڈرتے ہو، یہاں تک کہ اپنی ذات سے بھی۔ تم آسمان سے ڈرتے ہو۔ حالانکہ وہ امن و سلامتی کا سرچشمہ ہے، فطرت سے ڈرتے ہو، حالانکہ وہ اطمینان و راحت کا گہوارہ ہے۔ خداؤں کے خائف ہو اور عداوت و غضب کو اس کی ذات سے منسوب کرتے ہو حالانکہ وہ اگر

محبّت - رحمت نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے"!

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد جس میں لطیف خواب گھلے ملے تھے - میں نے اس سے پوچھا :-

"یہ جمال کیا ہے ؟ کیونکہ لوگ تو اس کی تعریف تجدید میں مختلف الرائے ہیں - بالکل اسی طرح جیسے اس کی محبت دلکریم میں"!

اس نے جواب دیا :-

"جمال وہ ہے جس کی طرف تو خود بخود کھنچے ـــــ جسے دیکھ کر تو اسے دینا چاہے اس سے لینا نہ چاہئے ـــــ جسے اجسام مصیبت اور ارواح عطیہ سمجھیں ـــــ جو رنج اور خوشی کے درمیان رشتۂ اتحاد ہو ـــ جسے تو روپوشی میں جلوہ فرما دیکھے - لاعلمی میں آشنا پائے اور خاموشی میں بولتے سُنے ـــ جو ایک قوت ہے جس کا آغاز تیری ذات کی انتہائی پاکیزگی سے ہوتا ہے اور انتہا اس نقطہ پر، جو تیرے تصوّرات سے ماورا ہے۔

جنگل کی شہزادی میرے قریب آئی اور اپنا معطّر ہاتھ میری آنکھ پر رکھ دیا - جب اس نے اپنا ہاتھ میری آنکھ سے ہٹایا تو میں نے خود کو اسی وادی میں تنہا پایا - میں وہاں سے لوٹ آیا دل ہی دل میں کہتا ہوا - اور بار بار کہتا ہوا :

"جمال وہ ہے ، جسے دیکھ کر تو اسے دینا چاہے - اس سے لینا نہ چاہے"!

حکمت کی زیارت

رات کی خاموشی میں حکمت آئی اور میرے پلنگ کے پاس کھڑی ہوگئی۔ ایک شفیق ماں کی طرح اس نے میری طرف دیکھا اور میرے آنسو پونچھ کر بولی :۔

"میں نے تیری روح کی پکار سنی اور تیری تشفی کے لیے آگئی۔ اپنا دل میرے سامنے کھول! تاکہ میں اسے نور سے لبریز کر دوں۔ میرا دامن تھام! تاکہ میں تجھے حقیقت کا راستہ دکھاؤں۔"

میں نے پوچھا:۔

"اے حکمت! میں کون ہوں ؟ اور اس خوفناک مقام پر کیسے آپہنچا ہوں! —— یہ اہم خواہشیں، یہ کثیر التعداد کتابیں اور یہ عجیب و غریب تصویریں کیا ہیں ؟ —— یہ افکار کیا ہیں، جو کبوتروں کے جھلڑوں کی طرح پھڑپھڑاتے گزر جاتے ہیں ؟ —— یہ کلام کیا ہے، جسے میلان مرتب کرتا اور لذت منتشر کر دیتی ہے ؟ —— یہ غم آفرین و فرحت بخش نتائج کیا ہیں جو میری

روح سے ہمکنار اور میرے دل کے لیے ہوش رُبا ہیں؟ —— یہ مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والی آنکھیں کیا ہیں، جو میری گہرائیوں کو دیکھ رہی ہیں اور میرے آلام کی طرف سے بند ہیں؟ —— یہ میری زندگی پہ ماتم کرنے والی آوازیں کیا ہیں، جو میری بے بضاعتی پر مترنم ہیں؟ —— یہ میری تمناؤں سے کھیلنے والا شباب کیا ہے؛ جو میرے جذبات کا مذاق اُڑاتا ہے۔ ماضی کے افعال و اعمال کو بھلا دیتا ہے۔ حال کی بے کیفی پر مسرور ہے اور مستقبل کی سست قدمی پر ناک بھوں سکیڑتا ہے؟ —— یہ عالم کیا ہے، جو مجھے ایسی جگہ لے جا رہا ہے جسے میں نہیں جانتا۔ اور جو میرے ساتھ مقامِ ذلت پر کھڑا ہے؟ —— یہ زمین کیا ہے جو اجسام کو نگل جانے کے لیے مُنہ کھولے ہوئے ہے اور جس نے حرص و طمع کو آباد کرنے کے لیے اپنا سینہ چیر دیا ہے؛ —— یہ انسان کیا ہے، جو سعادت و کامرانی کی محبت پر راضی ہے، حالانکہ اس کی محبت دوزخ کے انتہائی طبقہ تک نہیں پہنچی ہے، جو بوسۂ حیات کا طالب ہے اور موت اس کے مُنہ پہ طمانچے مار رہی ہے، جو لذت کے ایک لمحہ کے لیے ندامت کا ایک سال خرید رہا ہے۔ جو نیند کے ہاتھ بک چکا ہے اور خواب اسے بلا رہے ہیں، جو نادانی و جہالت کی نہروں کے ساتھ ظلمت کی خلیج کی طرف جا رہا ہے؛ —— یہ تمام

چیزیں کیا ہیں ؟ اے حکمت !"
حکمت نے جواب دیا :۔

"اے آدم زاد! تو اس دُنیا کو اللہ کی آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہے ۔ آنے والے زمانے کے بھیدوں کو انسانی فکر کے ذریعہ سمجھنا چاہتا ہے ۔ اور یہ حماقت کی انتہا ہے ۔ جنگل میں جا! تو شہد کی مکھی کو پھولوں پر بھنبھناتے اور عقاب کو شکار پر منڈلاتے دیکھے گا ۔ اپنے ہمسائے کے گھر میں داخل ہوا تو بچّہ کو آگ کے شعلوں سے گھبراتے اور ماں کو گھر کا کام کاج کرتے پائے گا۔ شہد کی مکھی کی مثال ہو جا اور بہار کے دن عقاب کے اعمال دیکھنے میں برباد نہ کر ۔۔۔۔ بچّہ کی مثال ہو جا اور اپنی ماں کو اس کے حال پر چھوڑ کر آگ کے شعلوں سے فرحت حاصل کر!

جو کچھ تو دیکھتا ہے وہ تیرے ہی لیے تھا اور تیرے ہی لیے ہے، یہ کثیر التعداد کتابیں، یہ عجیب و غریب تصویریں اور یہ حسین و جمیل افکار، ان لوگوں کی پرچھائیاں ہیں جو تجھ سے پہلے گزر چکے ہیں ۔ یہ کلام جسے تو مرتب کرتا ہے، تیرے اور تیرے بھائی ۔۔۔۔ بنی نوعِ انسان کے درمیان رشتۂ اتحاد ہے، یہ غم آفریں اور فرحت بخش نتائج وہ بیج ہیں جنہیں ماضی نے روح کے کھیت میں بویا ہے اور جن کا ثمر مستقبل حاصل کرے گا ۔۔۔۔۔۔ یہ تیری

تمناؤں سے کھیلنے والا شباب، تیرے دل کے دروازہ کو کھولنے والا ہے تاکہ اس میں نور داخل ہو سکے۔ یہ منہ کھولے ہوئے زمین وہ ہے جو تیری روح کو تیرے جسم کی غلامی سے نجات دلائے گی۔ یہ تجھے اپنے ساتھ لے جانے والا عالم، تیرا دل ہے اور تیرا دل وہ سب کچھ ہے جسے تو عالم سمجھتا ہے اور یہ انسان جو تجھے حقیر و جاہل نظر آرہا ہے۔ وہ ہے جو غم سے خوشی کی اور ظلمت سے معرفت کی تعلیم حاصل کرنے، جوار خداوندی سے آیا ہے۔"

حکمت نے اپنا ہاتھ میری بھڑکتی ہوئی پیشانی پر رکھا اور کہا:۔

"آگے بڑھ اور کہیں منزل نہ کر! کہ آگے بڑھنے کا دوسرا نام کمال ہے —— بڑھ اور راستہ کے کانٹوں سے نہ ڈر! کہ یہ کانٹے فاسد خون نکالنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے!!"

دوست کی کہانی

میں نے اسے ایک نوجوان دیکھا، جو زندگی کی راہوں میں گم، شباب کے اثرات سے مغلوب اور اپنی خواہشوں کا اصلی سبب معلوم کرنے کے لیے مرا جاتا تھا، ایک نرم و نازک پھول پایا، جسے تند ہوائیں لایعنی تمناؤں کے اتھاہ سمندر کی طرف اڑائے لیے جا رہی تھیں۔

میں نے اسے گاؤں میں ایک شریر لڑکا دیکھا، جو پرندوں کے گھونسلے برباد کر کے ان کے بچّوں کو مار ڈالتا تھا۔ پھولوں کی نازک پنکھڑیوں کو روند کر ان کے حسن و دلکشی کو غارت کر دیتا تھا، مدرسہ میں ایک نوجوان پایا، جسے لکھنے پڑھنے سے کوئی سروکار نہ تھا، جو خاموشی کا دشمن اور بدتمیزیوں کی پوٹ تھا اور شہر میں ایک کڑیل جوان دیکھا، جو گھناؤنے بازاروں میں آبائی شرافت کا سودا کرتا پھرتا تھا، ننگ و ذلت کے شبستانوں میں دونوں ہاتھوں سے دولت لٹاتا تھا۔ جس نے اپنی عقل 'بنتِ زر' کے حوالے کر دی تھی۔

لیکن ان تمام برائیوں کے باوجود میں اس سے محبت کرتا تھا ——

ایسی محبت جس میں افسوس کے ساتھ ہمدردی شامل تھی۔ میں اسے جاہتا تھا اس لیے کہ یہ تمام بری عادتیں طبیعی نہیں، اس کی کمزور اور مایوس فطرت کا نتیجہ تھیں۔

لوگو! نفس انسانی بجبر و اکراہ عقل و حکمت کی راہوں سے ہٹتا ہے اور خوشی خوشی ان کی طرف لوٹتا ہے۔ جرائم کی آندھیاں گرد و غبار کو اپنے دامن میں لے کر اٹھتی ہیں، جو آنکھوں میں گھس کر انہیں بند کر دیتا ہے ——— اندھا کر دیتا ہے، اور بسا اوقات ایک طویل مدت کے لیے اندھا کر دیتا ہے۔

میں اس نوجوان سے محبت کرتا تھا اور میرے دل میں اس کے لیے خلوص بے انتہا خلوص ——— تھا۔ کیونکہ میں دیکھتا تھا کہ اس کے ضمیر کا کبوتر اس کی بداعمالیوں کے گدھ پر غالب آنا چاہتا ہے۔ لیکن مغلوب ہو جاتا ہے ——— اپنی بزدلی کی بنا پر نہیں، اپنے دشمن کی قوت کی وجہ سے!

ضمیر ایک انصاف پسند مگر کمزور قاضی ہے جس کی کمزوری اس کے حکم جاری کرنے کی راہیں روکے کھڑی ہے۔

میں نے کہا ہے: میں اس سے محبت کرتا تھا اور محبت مختلف بھیس بدل کر آتی ہے ——— کبھی حکمت کے بھیس میں کبھی انصاف کے بھیس میں۔ مجھے ان سے جو محبت تھی وہ اس آرزو کے بھیس میں تھی کہ اس کے آفتاب فطرت کی

روشنی اس کی عارضی بدنمزانیوں کی ظلمت پر غالب آجائے۔ لیکن میں اس سے ناآشنائے محض تھا کہ اس کی آلودگی پاکیزگی سے، بداخلاقی خوش اخلاقی سے اور جہالت عقلمندی سے کب اور کیونکر بدلے گی؛ انسان نہیں جانتا کہ روح مادہ کی قید و بند سے کس طرح آزاد ہوتی ہے؛ جب تک وہ آزاد نہ ہو جائے، اسے معلوم نہیں کہ پھول کیونکر مسکراتے ہیں؛ جب تک ملکۂ سحر اپنے روشن چہرہ سے نقاب نہ الٹ دے!

(۲)

دن رات کے کندھوں پر سوار ہو کر گزرتے رہے۔ میں اس نوجوان کو رنج والم کے انتہائی احساس کے ساتھ یاد کرتا تھا اور ان ٹھنڈے سانسوں کے ساتھ اس کا نام لیتا تھا۔ جو دل میں زخم ڈال ڈال کر اس کا خون کئے دیتے تھے۔ یہاں تک کہ کل مجھے اس کا ایک خط ملا، جس میں لکھا تھا:۔

"پیارے دوست! میرے پاس ہو جاؤ! میں تمہیں
ایک نوجوان سے ملانا چاہتا ہوں، جسے دیکھ کر تمہارا
دل خوش ہوگا اور جس سے مل کر تمہاری روح مسرور!"

میں نے کہا: "افسوس! کیا وہ یہ چاہتا ہے کہ اپنی دوستی کی غم آفرینوں کو اپنی ہی جیسی ایک اور دوستی سے دوگنا کردے! کیا وہ خود ضلالت و گمراہی کے

متن کی تشریح و توصیف کے سلسلہ میں کافی مثال نہیں ہے ؛ اور کیا اب اس کی خواہش یہ ہے کہ اس مثال پر اپنے دوستوں کے حالات کا حاشیہ چڑھائے تاکہ مادّہ کی کتاب کا کوئی حرف میری نگاہوں سے اوجھل نہ رہ جائے"؟

میرے خیالات کا رُخ بدلا" لیکن مجھے جاننا چاہیے اگر نفس اپنی حکمت سے کام لے کر کانٹوں میں سے پھول چن لیتا ہے اور دل اپنی محبت کے بل پر تاریکی کے سینہ سے نور کھینچ لیتا ہے"۔

جب شام ہوئی تو میں اس سے ملنے گیا اور دیکھا کہ وہ اپنے کمرہ میں تنہا بیٹھا کوئی دیوان پڑھ رہا ہے، کتاب اس کے ہاتھ میں دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہُوا اور میں نے سلام کر کے اس سے پوچھا،

"وہ نئے دوست کہاں ہیں"؟

اس نے جواب دیا:

"میرے دوست ! وہ میں ہی ہوں"!

یہ کہہ کر وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ جو میرے لیے ایک بالکل نئی چیز تھی، اور میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب نور تھا۔ جو سینہ کو چیر کر جسم کے ہر رگ اور ریشہ کو اپنے حلقہ میں لے رہا تھا۔ وہ آنکھیں جنہیں میں نے جب دیکھا درشتی و سنگ دلی کے سوا ان میں کچھ نہ پایا۔ اب ان سے

وہ روشنی پھوٹ رہی تھی جو دل کو لطف و مہربانی سے لبریز کئے دیتی تھی۔ آخرکار اس نے ایک ایسی آواز میں جسے میں یہ سمجھا کہ اس کے حلق سے نہیں کسی اور کے حلق سے نکل رہی ہے کہا،

"وہ شخص جسے تم بچپن میں جانتے تھے، طالب علمی کے زمانہ میں جس کی تم نے رفاقت کی، جوانی میں جس کے تم ساتھ ساتھ رہے، اب مرچکا ہے اور اس کی موت سے میں پیدا ہوا ہوں۔ میں تمہارا نیا دوست ہوں، مجھ سے ہاتھ ملاؤ!"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے ہاتھ میں ایک لطیف روح ہے، جو خون کے ساتھ گردش کر رہی ہے —— وہ محنت اور کھُردرا ہاتھ اب نرم و نازک ہو گیا تھا، وہ انگلیاں جو اپنے اعمال کی بنا پر کل تک چلتے کے بچھ سے مشابہ تھیں آج اپنی رقت و لطافت کی بنا پر دل کو کوس رہی تھیں۔ کاش! میں اپنی بات کی غرابت کو یاد رکھ سکتا، جو اس وقت میں نے اس سے پوچھی :-

"تم کون ہو؟ یہ تبدیلی تم میں کیسے اور کہاں پیدا ہوئی! کیا روح نے تمہارے جسم کو عبادت کدہ بنا کر تمہیں مقدس کر دیا ہے۔ یا تم میرے سامنے کسی شاعرانہ دور کی تمثیل پیش کر رہے ہو؟"

اس نے جواب دیا " ہاں۔ میرے دوست! روح نے مجھ میں نزول فرماکر مجھے پاک کردیا ہے اور عظیم الشان محبت نے میرے دل کو مقدس قربان گاہ بنادیا ہے۔ اور وہ عورت ہے میرے دوست! —— وہ عورت، جسے کل تک میں مرد کا کھلونا سمجھتا تھا۔ لیکن آج اس نے مجھے جہنم کی تاریکی سے نکال کر جنت کے دروازے میرے لیے کھول دیئے اور میں اس میں داخل ہوگیا۔

وہ حقیقی عورت، جو مجھے اپنی محبت کے عشرت کدہ میں لے گئی اور میرے لیے سہارا بنی!

وہ عورت، جس کی بہنوں کو میں نے اپنی جہالت سے ذلیل کیا لیکن اس نے مجھے تختِ عظمت پر بٹھادیا۔ وہ عورت، جس کی ہم جنسوں کو میں نے اپنی نادانی سے خراب کیا۔ لیکن اس نے اپنی محبت سے مجھے پاک کردیا۔

وہ عورت، جس کی ہم جنسوں کو میں نے اپنی دولت سے اپنا غلام بنایا۔ لیکن اس نے اپنے حسن و جمال کا نور مجھ پر برساکر مجھے آزاد کردیا۔

وہ عورت جس نے اپنی قوت ارادی اور آدمؑ کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر اسے جنت سے نکالا۔ آج اپنی مہربانی اور میری اطاعت کے زیر اثر مجھے اسی جنت میں لے گئی "

اس وقت میں نے اس کی طرف دیکھا، آنسو اس کی آنکھوں میں چمک رہے تھے۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ اور محبت کی شعاعوں کا تاج اس کے سر پر رکھا تھا۔ میں اس کے قریب گیا اور ازراہِ برکت طلبی اس کی پیشانی کو بوسہ دیا، جس طرح کاہن قربان گاہ کے صحن کو بوسہ دیتا ہے۔ اس کے بعد میں نے اس سے رخصت چاہی اور اس کا یہ فقرہ دل ہی دل میں دہراتا ہوا واپس آگیا: "وہ عورت جس نے اپنی قوتِ ارادی اور آدمؑ کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر اسے جنّت سے نکالا، آج اپنی مہربانی اور میری اطاعت کے زیرِ اثر مجھے اسی جنّت میں لے گئی۔"

حقیقت اور خیال

زندگی ہمیں ایک جگہ سے دوسری جگہ اور تقدیر ایک دائرہ سے دوسرے دائرہ میں لے جاتی ہے۔ ہم کچھ نہیں دیکھتے، سوائے اس چیز کے جو ہماری راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو جاتی ہے اور کچھ نہیں سنتے، سوائے اس آواز کے جو ہمیں دہلا دیتی ہے۔

حسن اپنی عظمت و بزرگی کے تخت پر ہمارے لیے بے نقاب ہوتا ہے اور ہم عشق کے نام پہ اس کے دامن کو داغ دار کرتے اور اس کے سر سے پاکیزگی کا تاج اتار دیتے ہیں۔

محبت، بردباری کا لباس پہنے ہمارے پاس سے گزرتی ہے اور ہم اس سے ڈر کر ظلمت کے غاروں میں جا چھپتے ہیں۔ یا اس کے پیچھے پیچھے چل کر اس کے نام پہ بدکاریاں کرتے ہیں ہم میں سے جو اہلِ نظر ہوتا ہے وہ اسے ایک بھاری جرا سمجھ کر اٹھاتا ہے۔ حالانکہ وہ پھولوں کی مہک سے زیادہ لطیف اور لبنان کی ہواؤں سے زیادہ نرم و سبک ہے۔

حکمت، دوراہوں پر کھڑے ہو کہ ہانکے پکارے ہمیں اپنی طرف بلاتی ہے اور ہم اسے جھوٹ سمجھ کر اس کے پیروؤں کو ذلیل کرتے ہیں۔

آزادی ہمیں اپنے دسترخوان کی طرف دعوت دیتی ہے تاکہ ہم اس کی شراب اور غذاؤں سے خوش کام ہوں۔ چنانچہ ہم جاتے ہیں اور ساری چیزیں بکھیر دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ دسترخوان رکابت و ابتذال کا میدان اور اہانتِ ذات کی جولاں گاہ بن جاتا ہے۔

فطرت دوستی کا ہاتھ ہماری طرف بڑھاتی ہے اور چاہتی ہے کہ ہم اس کے جمال سے فائدہ اُٹھائیں لیکن ہم اس کی خاموشی سے خوف زدہ ہو کر شہر کی طرف بھاگتے ہیں اور وہاں ایک دوسرے پر اس طرح گرتے ہیں گویا بھیڑوں کا ریوڑ بھیڑیئے کو دیکھ کر بھاگ رہا ہے۔

حقیقت بچّے کی مسکراہٹ یا محبوبہ کے بوسہ کے ساتھ مطیع و فرماں بردار کی حیثیت سے ہم سے ملنے آتی ہے اور ہم اپنے جذبات کے سارے دروازے اس پر بند کر کے ایک بدکار مجرم کی طرح اسے بھگا دیتے ہیں۔

انسانی دل ہم سے مدد مانگتا ہے اور نفس ہمیں پکارتا ہے۔ لیکن ہم جنگ سے زیادہ بہرے ہیں، کچھ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں اور اگر کوئی اپنے نفس کی آواز اور اپنے دل کی پکار سنتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ دیوانہ ہے اور اس

سے بیزاری و بے تعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔

راتیں اس طرح گزر رہی ہیں اور دن اس طرح ہم سے ہاتھ ملا رہے
ہیں۔ لیکن ہم غافل ہیں اور شب و روز سے خائف!

ہم مٹی میں مل جاتے ہیں اور ابدی قوت ہم سے خود کو منسوب کرتی ہے
ہم طعامِ حیات کے پاس سے گزرتے ہیں اور بھوک ہماری قوتوں کو
کھائے جاتی ہے۔

اُف! کتنی پیاری ہے ہم کو زندگی اور کتنے دُور ہیں ہم زندگی سے!!

قسمت کے مارے

اے وہ کہ بستر بدبختی پہ پیدا ہُوا۔ ذلّت کی آغوش میں پلا اور ظلم و استبداد کے مکانوں میں جوان ہُوا۔ تو وہ ہے جو ٹھنڈے سانس بھر بھر کر سُوکھی روٹی کھاتا اور آنسوؤں سے گدلا پانی پیتا ہے!

اور اے وہ سپاہی! جو انسان کے ظالمانہ قوانین کی رُو سے اس بات پر مجبور ہے کہ اپنے بیوی بچّوں اور دوست احباب کو چھوڑ کر عرصۂ مرگ میں جائے اس حرص و طمع کا پیٹ بھرنے کے لیے جسے دنیا "فرض" کے نام سے پکارتی ہے۔

اور اے وہ شاعر! جو اپنے وطن میں بے وطن اور اپنے جاننے والوں میں انجان ہے۔ جو زندگی کی آسائشوں میں صرف ایک لقمہ اور مادّی نعمتوں میں سے صرف روشنائی اور کاغذ پر قانع ہے۔

اور اے وہ قیدی! جو قید خانہ کی تاریکیوں میں پڑا ہے۔ ایک معمولی سے گناہ کی پاداش میں، جسے لوگوں کی گمراہیوں نے مشکل کیا ہے۔ جو برائی

کا مقابلہ برائی سے کرتے ہیں اور جسے ان احمقوں کی عقلیں ان کا سمجھتی ہیں جو فساد کے ذریعہ اصلاح کرنی چاہتے ہیں۔

اور اے وہ غریب لڑکی! جسے اللہ نے حسن و جمال سے نوازا ہے آج کل کے نوجوانوں نے تجھے دیکھا اور تیرا پیچھا کیا، تجھے بہکایا اور اپنے زر و مال سے تیری محتاجی پر قبضہ پالیا۔ لیکن جب تو نے اپنی عزت اس کے حوالے کر دی تو وہ تجھے ذلت اور بدبختی کے چنگل میں تڑپنے والے شکار کی طرح چھوڑ کر چلا گیا۔

تم سب اسے میرے کمزور دوستو! انسانی قانون کے شہید ہو! تم بدقسمت ہوا اور تمہاری بدقسمتی نتیجہ ہے طاقت ور کی زبردستی، حاکم کے جور مال دار کے ظلم اور بندگانِ شہوت کی انانیت کا!

لیکن تمہیں مایوس نہ ہونا چاہیئے! کہ اس دنیا کے ظلم و ستم کے پیچھے مادّہ کے پیچھے، بادلوں کے پیچھے، ایتھر کے پیچھے — ہر چیز کے پیچھے ایک قوّت ہے۔ تمام انصاف، تمام شفقت، تمام رحمت، اور تمام محبّت!

تم ان پھولوں کی مثال ہو، جو سائے میں اُگتے ہیں۔ لیکن عنقریب ہوا کی نرم و لطیف موجیں آئیں گی اور تمہارے بیجوں کو سُورج کی روشنی

میں لے جائیں گی - جہاں تم حسین زندگی بسر کرنے گے -

تم ان بے برگ و بار درختوں کی نظیر ہو، جو موسم سرما کی برف باریوں سے گراں بار ہیں، لیکن بہار بہت جلد آئے گی اور تمہیں سرسبز و شاداب پتوں کا لباس پہنا دے گی -

وہ دن اب دُور نہیں جب حقیقت آنسوؤں کی اس چادر کو تار تار کر دے گی - جس نے تمہاری مسکراہٹوں کو چھپا رکھا ہے !

میں تمہیں پیار کرتا ہوں میرے بھائیو! اور تم پر ظلم کرنے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں !!

نالہ و شیون

صبح سویرے ـــــ اس سے پہلے کہ سورج شفق کے پیچھے سے طلوع ہوتا، میں سبزہ زار کے وسط میں بیٹھا فطرت سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ اس وقت جو حسن و پاکیزگی سے لبریز تھا ۔ جب انسان نیند کے لحافوں میں دبکا کبھی سوتا کبھی جاگتا تھا، میں گھاس پہ ٹیک لگائے دل ہی دل میں حقیقتِ جمال کے متعلق رائے معلوم کر رہا تھا اور جمالِ حقیقت کی وہ داستان سننی چاہتا تھا جو مشاہدہ کی آنکھ سے گزر چکی تھی ۔

جب میرے تصورات نے مجھے عالمِ انسانی سے الگ کر دیا، میرے تخیلات نے میری ذاتِ معنوی پر سے مادی نقاب ہٹا دی، تو میں نے اپنی روح میں ایک بالیدگی محسوس کی، جو مجھے فطرت سے قریب کر رہی تھی۔ اس اسرار کی باریکیاں مجھ پر ظاہر کر رہی تھی اور احساس کی نت نئی ایجادات کی زبان مجھے سمجھا رہی تھی ۔

میں اسی عالم میں تھا کہ ہوا کا ایک جھونکا لیے یار و مددگار یتیم کی

طرح ٹھنڈا سانس بھرتا تھا شاخوں میں سے گزرا ۔ میں نے اس سے پوچھا:
"اے ہوا۔ کے لطیف جھونکے! تو ٹھنڈے سانس کیوں بھر رہا ہے؟"

اس نے جواب دیا:۔

آفتاب کی تمازت نے مجھے شہر کی طرف بھاگ جانے پر مجبور کر دیا ہے اور میں اس شہر میں جا رہا ہوں جہاں بیماری کے جراثیم میرے پاک و صاف دامن سے لپٹ جائیں گے اور انسان کے زہریلے سانس مجھ سے چمٹ جائیں گے یہ ہے وہ سبب جس کی بنا پر تم مجھے غمگین دیکھ رہے ہو!"

اس کے بعد میں پھولوں کی طرف متوجہ ہوا اور دیکھا کہ شبنم کے قطرے ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی طرح بہہ رہے ہیں ۔ میں نے پوچھا:۔

"حسین پھولو! تم کیوں رو رہے ہو؟"

ان میں سے ایک نے اپنا لطیف سر اٹھایا اور جواب دیا:

"ہم اس لیے رو رہے ہیں کہ انسان آئے گا اور ہماری گردنیں کاٹ ڈالے گا۔ پھر ہمیں شہر میں لے جا کر غلاموں کی طرح بیچے گا۔ حالانکہ ہم آزاد

ہیں جب شام ہوگی اور ہم مرجھا جائیں گے تو ہمیں کوڑے ہیں پھینک دے گا۔ تمہیں بتاؤ! ہم کیوں نہ روئیں جبکہ انسان کا بے درد ہاتھ ہمیں ہمارے وطن ——— سبزہ زار سے جدا کر دے گا!"

تھوڑی دیر کے بعد میں نے سُنا کہ نہر اس ماں کی طرح بین کر رہی ہے جس کا اکلوتا بچہ مرگیا ہو۔ میں نے پوچھا:

"اے شیریں نہر! یہ نالہ و شیون کس لیے؟"

اس نے جواب دیا:

"اس لیے کہ میں مجبوراً شہر کی طرف جا رہی ہوں۔ جہاں انسان مجھے حقیر و ذلیل کرتا ہے، میرے بدلے افشردۂ انگور طلب کرتا ہے اور مجھ سے اپنی غلاظتوں اور ناپاکیوں کو بہالے جانے کی خدمت لیتا ہے۔ میں بین کیوں نہ کروں جبکہ عنقریب میری صفائی گندگی سے اور پاکیزگی میل کچیل سے بدل جائے گی"؟

اس کے بعد میں نے کان لگائے اور پرندوں کو ایک ایسا غم انگیز نغمہ گاتے سُنا، جو نالہ و ماتم سے مشابہ تھا۔ میں نے پوچھا:۔

"خوب صورت پرندو! تم کس لیے فریاد کر رہے ہو"؟

ایک چڑیا میرے قریب آئی اور ایک شاخ کے کنارے کھڑی ہو کر

کہنے لگی:

"ابنِ آدم اپنا جہنمی آلہ لے کر آئے گا اور ہمیں اس طرح کاٹ کر ڈال دے گا جیسے درانتی کھیت کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اس لیے ہم ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ ہمیں معلوم نہیں ہم میں سے کون اس ناگزیر قسمت کے جال سے بچ نکلے۔ ہم فریاد کیوں نہ کریں جبکہ موت ہر جگہ ہمارے پیچھے پیچھے ہے"؟

آفتاب پہاڑ کے پیچھے سے طلوع ہوا، اس نے درختوں کی پھننگوں کو سنہری تاج پہنا دیئے، اور میں اپنے دل سے پوچھنے لگا:۔

"انسان ان چیزوں کو کیوں برباد کرتا ہے جنہیں فطرت بناتی ہے"؟

جھونپڑی اور محل

(۱)

شام ہوئی اور کہربائی روشنی سے سرمایہ دار کا محل جگمگانے لگا۔ دروازوں پر خادم، مخملی لباس پہنے، جس کے بٹن ان کے سینوں پر چمک رہے تھے۔ مہمانوں کا انتظار کرنے لگے۔

اربابِ نشاط نے فنی کمالات دکھانے شروع کیے اور فضا طرب ناک نغموں سے گونجنے لگی۔ شہر کے بڑے بڑے لوگ ـــــ مرد بھی اور عورتیں بھی ـــ شاندار گاڑیوں میں سوار، جن میں خوبصورت اور موٹے تازے گھوڑے جُتے ہوئے تھے، جوق در جوق محل کی طرف آرہے تھے اور غرور سامارت میں سرشار، زرکار چوبی لباس پہنے عزت و فخر کے دامنوں کو گھسیٹتے دروازوں میں داخل ہو رہے تھے۔

مرد کھڑے ہوئے اور عورتوں کو رقص کی دعوت دی۔ عورتیں اٹھیں اور اپنے اپنے رفیقِ رقص کو انتخاب کر کے ناچنے لگیں۔ سارا محل ایک باغ کی مثال ہو گیا، جس میں نسیمِ موسیقی کی لطیف موجیں رواں تھیں اور پھول غرور و تمکنت

سے لہرانے لگتے۔

رات بھیگی۔ دسترخوان بچھایا گیا جس پر بہتر سے بہتر میوے اور رنگ برنگ کے خوش ذائقہ کھانے چُنے گئے۔ اس کے بعد پیمانے گردش میں آئے اور بنت زمان کی عقلوں کو کمزور کر کے ان سے کھیلنے لگی۔

صبح ہوئی اور دولت و شرافت کے ان دیوتاؤں کی جماعت منتشر ہونے لگی، ایسی حالت میں کہ بیداری نے انہیں تھکا دیا تھا۔ شراب نے ان کی عقلیں سلب کر لی تھیں۔ رقص نے انہیں بے جان کر دیا تھا اور خمار سے ان کے بدن ٹوٹ رہے تھے۔

انجام کار وہ سب کے سب اپنے اپنے نرم و گداز بستروں میں جا کر سو رہے۔

(۲)

سورج غروب ہونے کے بعد ایک مرد، محنت مزدوری کا لباس پہنے ایک چھوٹی سی جھونپڑی کے دروازہ پر کھڑا کٹیا کھٹکھٹا رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ مسکراتے ہوئے اس نے سلام کیا اور بچوں کے پاس بیٹھ کر آگ تاپنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی بیوی رات کا کھانا لائی اور وہ سب کے سب ایک لکڑی کی چھوٹی سی میز کے گرد بیٹھ کر بڑے بڑے نوالے مارنے لگے۔ کھانا ختم کر کے وہ اٹھے اور ایک چراغ کے قریب بیٹھ

گئے جو اپنی کمزور زرد شعاعوں کے تیر ظلمت کے سینہ میں پیوست کر رہا تھا۔
رات کا ابتدائی حصّہ گزر جانے کے بعد وہ سب کے سب نہایت خاموشی کے ساتھ اُٹھے اور خود کو مملکتِ خواب کے حکمران کے سپرد کر دیا۔

صبح ہوئی اور وہ غریب نیند سے بیدار ہُوا اپنے چھوٹے چھوٹے بچوّں اور بیوی کے ساتھ تھوڑی سی روٹی کھائی اور تازہ دودھ پیا، اس کے بعد بچوّں کو پیار کیا اور اپنا بھاری ہل کندھے پر لاد کر کھیت کی طرف چل دیا تاکہ اسے اپنے ماتھے کے پسینے سے سینچے اور بار آور کرے۔ اپنی قوتیں ان طاقتور سرمایہ داروں کو کھلائے جنہوں نے کل کی رات عیش و سرمستی میں گزاری تھی۔

سوُرج پہاڑ کے پیچھے سے طلوع ہُوا اور گرمی کے قدم اس غریب کسان کے سرپر بوجھل ہو گئے، لیکن سرمایہ دار ابھی تک اپنے عالی شان محلوں میں غافل پڑے سو رہے تھے۔

یہ ہے انسان کی ٹریجیڈی جو زمانہ کے اسٹیج پر کھیلی جا رہی ہے۔ دنیا کی تفریحات سے دل بہلانے والے اور اس کی تعریف کرنے والے تو بہت ہیں لیکن اس کی المِ انگیز یوں اور غم آفرینیوں پر غور و تامل کرنے والے کم ہیں اور بہت ہی کم!

دو بچے

بادشاہ اپنے محل کے دریچہ میں آکر کھڑا ہوا اور اس ہجوم کو جو اس کے پائیں باغ میں کھڑا تھا۔ مخاطب کرتے ہوئے بولا:

"میں تمہیں خوش خبری سناتا اور ملک کو مبارک باد دیتا ہوں کہ تمہاری ملکہ کے ہاں فرزند ارجمند تولد ہوا ہے۔ جو میرے بزرگ خاندان کی عزت کو زندہ کرے گا تمہارے لیے فخر و پشت پناہی کا سبب ہوگا۔ اور میرے نامور بزرگوں کی یادگاروں کا وارث بنے گا۔ خوش ہو جاؤ! خدا کا شکر ادا کرو!! کہ تمہارا مستقبل ایک شریف و نجیب بچہ سے وابستہ ہو گیا۔

ہجوم نے نعرے لگائے اور فضا اس بچہ کی پیدائش کے سلسلہ میں خوشی کے ترانوں سے گونجنے لگی، جو عشرت و آسودگی کی آغوش میں پروان چڑھے گا اور عزت و احترام کی کرسی پہ جوان ہو کر غلاموں کا حاکم مطلق ہوگا۔ قوت کی بنا پر کمزوروں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے گا اور ان کے جسموں سے خدمت لینے اور ان کی جانوں کو ضائع کرنے میں بالکل آزاد ہوگا۔ یہ تھی وہ تقریب

جس بنا پر وہ خوشیاں منا رہے تھے۔ مسرت کے راگ الاپ رہے تھے اور بادۂ سرور کے قرابے پی رہے تھے۔

اس وقت ـــــ جبکہ اہل شہر طاقت ور کی تعظیم تکریم کر کے اپنی زبونیٔ فطرت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اور ظالم کے گن گا گا کر فرشتوں کو اپنی حقارت پر دلا رہے تھے، آبادی سے الگ ایک چھوٹے سے مکان میں افلاس و بیچارگی کی ماری ایک عورت بستر علالت پر دراز اپنے شیر خوار بچہ کو جو پھٹے پرانے چیتھڑوں میں لپٹا تھا، اپنے آتش ناک سینہ سے چمٹائے ہوئے تھی۔

ایک نوجوان عورت، جس کی قسمت میں زمانہ نے فقیری اور بفقری نے بدبختی لکھ دی تھی، اور جسے بنی نوع انسان نے بھلا دیا تھا۔

ایک بیوی، جس کے کمزور شوہر کو طاقتور حاکم نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

ایک بے یار و مددگار مخلوق، جسے اللہ نے اس رات کو چھوٹا سا رفیق عطا کیا تھا ـــ ایک ایسا رفیق جس نے اس کے ہاتھ باندھ کر اسے محنت مزدوری سے بھی معذور کر دیا۔

جب سڑکوں پر لوگوں کا شور و غل ختم ہوا تو اس غریب نے اپنے بچہ کو گود میں لیا اور اس کی روشن آنکھوں کو دیکھ کر زار زار رونے لگی، گویا گرم گرم آنسوؤں سے اسے بپتسمہ دینا چاہتی ہے۔ ایک ایسی آواز میں جسے سن کر چٹانیں

بھی پاش پاش ہو جائیں، اس نے کہنا شروع کیا۔
"میرے کلیجہ کے ٹکڑے! تو عالم ارواح سے کیوں آیا ہے؟ میری تلخ زندگی میں حصّہ گیر ہونے کی طمع میں؟ یا میری بے کسی پر رحم کھانے کے لیے؟ تو فرشتوں اور وسیع فضا کو چھوڑ کر تنگ اور ذلّت و بدبختی سے بھری ہوئی دنیا میں کیوں آیا ہے؟
میرے اکلوتے بچّے! میرے پاس آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ہے! کیا تو دودھ کے بدلے میرے آنسو پیے گا۔ کیا کپڑے کی بجائے میرے ننگے بازوؤں کو تو اپنا لباس بنائے گا؟
جانوروں کے بچّے گھاس چرتے ہیں اور اطمینان سے باڑوں میں رات گزارتے ہیں۔ پرندوں کے بچّے دانہ چگتے ہیں اور آرام سے شاخوں میں سوتے ہیں، لیکن میرے لال! تیرے لیے میری کمزوری اور آہوں کے سوا کچھ نہیں!
یہ کہہ کر اس نے بچّے کو سینے سے بشدّت چمٹا لیا، گویا دو جسموں کو ایک جسم بنا دینا چاہتی ہے۔ اور آسمان کی طرف دیکھ کر چلّائی:
"یارب! ہم پر رحم کر!"
جب بادل چھٹے اور چاند نمودار ہوا تو اس کی لطیف شعاعیں کھڑکی میں سے اس چھوٹے سے مکان میں داخل ہوئیں اور دو بے حس و حرکت جسموں پر بکھر گئیں۔

شعرائے سلف

اگر خلیل سوچتا کہ وہ اوزان جن کی لڑیاں اس نے پروئی ہیں اور جن کی بندشیں اس نے مضبوط کی ہیں ایک پیمانہ بن جائیں گے جس کے ذریعہ شاعرانہ طبع آزمائیوں کی ناپ تول کی جائے گی - ایک رشتہ بن جائیں گے جس میں افکار کی سیپیاں لٹکائی جائیں گی، تو وہ قطعی طور پر ان لڑیوں کو بکھیر دیتا اور ان بندشوں کی گرہیں کھول دیتا -

اگر متنبی اور فارض کو معلوم ہوتا کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ بانجھ افکار کا سبب ہو جائے گا، آج کل کے تشاعروں کے گلے کا لٹکا بن جائے گا تو وہ لازماً دواتوں کو طاقِ نسیاں کر دیتے اور بے نیازی و بے پروائی کے ہاتھوں سے قلم توڑ ڈالتے -

اور اگر ہومر، ورجل، ابوالعلاء المعری اور ملٹن کی روحیں جانتیں کہ وہ شعر جس کی روح عظمتِ خداوندی سے مشابہ ہے، امیروں کے درباروں میں پیش کیا جائے گا۔ تو وہ ایک لمحہ کی تاخیر کئے بغیر ہماری اس زمین پر لات مار کر

سیاروں میں جا چُھپتے ہیں -

میں ان میں سے نہیں ہوں - جو خواہ مخواہ لوگوں کو پریشان کرتے ہیں - لیکن یہ تکلیف میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے کہ جاہلوں کو روحوں کی زبان بولتے سنوں - اور جھوٹے دعویداروں کے قلم سے دیوتاؤں کی نعمتیں صفحۂ کاغذ پر منتقل ہوتے دیکھوں - اس رنج و عذاب کے گڑھے میں ایک میں ہی تنہا نہیں ہوں بلکہ اور بھی بہت سے ہیں جو مینڈک کو اپنے تئیں بھینس ثابت کرنے کے لیے پھولتے دیکھتے ہیں -

لوگو! شعر ایک مقدس روح ہے جس کی تجسیم اس تبسم سے ہوتی ہے جو دل کو زندگی بخشتا ہے - یا اس ٹھنڈے سانس سے جو آنکھوں سے آنسو چرا تا ہے، وہ ایک پرچھائیں ہے جس کا مسکن روح، جس کی غذا دل اور جس کا مذہب جذبات ہیں اور اگر شعر ان صورتوں کے علاوہ کسی اور شکل میں ہو تو وہ یقیناً جھوٹے مسیح کی مثال ہے -

اس لیے اے شعر کی دیوی ——— اے اڈانو! ان لوگوں کو معاف کر! جو اپنے آپ کو اس کا وسیلہ بنا کر تیرے قریب آتے ہیں اور جو ذہنی رفعت اور فکری عظمت کے ساتھ تیری پرستش نہیں کرتے!

اور اسے ہمیں غیر فانی عالم کی بلندیوں سے دیکھنے والی شاعروں کی روح

ان قربان گاہوں تک نہ پہنچنے کے سلسلہ میں جنہیں تم نے اپنے افکار کے موتیوں اور ذہن و دماغ کے جواہر سے سجایا ہے، اس کے سوا اور کوئی عذر نہیں ہے کہ ہمارے زمانہ میں لوہے اور کارخانوں کا شور و غل حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے، جس کی وجہ سے ہمارے شعر ریل گاڑیوں کی طرح ثقیل و ضخیم اور دخانی انجن کی سیٹی کی طرح پریشان کن ہوگئے ہیں۔

اے حقیقی شاعرو! ہماری کوتاہیوں سے درگزر کرو! اگر ہم اس "دورِ جدید" میں ہیں جو مادیات کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ اس لیے شعر ہمارے نزدیک مادہ کی مثال ہوگیا ہے۔ جو ہاتھوں میں تو منتقل ہو سکتا ہے لیکن ذہن اسے نہیں سمجھ سکتا۔

زیرِ آفتاب

میں نے ان تمام اعمال کو جانچا، جو زیرِ آفتاب انجام دیے
گئے ہیں اور انہیں باطل و ناپائیدار پایا۔ (الجامعہ)

....

اے عالمِ ارواح کی فضا میں پرواز کرنے والی، سلیمان کی روح! اے وہ کہ تو نے مادّی لباس اتار دیا ہے، جو اس وقت ہم پہنے ہوئے ہیں! اور اپنے پیچھے کمزوری اور مایوسی سے پیدا شدہ کلام چھوڑ گئی ہے، جس نے تمام اجسام میں کمزوری اور مایوسی پیدا کر دی ہے۔

اب تو جانتی ہے کہ اس زندگی میں کچھ معانی ہیں جنہیں موت نہیں چھپا سکتی لیکن انسان اس بات کو نہیں سمجھ سکتا۔ تاوقتیکہ اس کی روح قیدِ آب و گل سے آزاد نہ ہو جائے۔

اب تو جانتی ہے کہ زندگی ناپائیدار نہیں ہے اور نہ زیرِ آفتاب کوئی چیز باطل ہے، اس کے برخلاف ہر شے حقیقت کی طرف جاری ہے اور جاتی رہے گی لیکن ہم بے چارے تیرے اقوال سے چمٹے رہے اور انہی پر غور کرتے رہے چنانچہ

آج بھی ہم انہیں روشن حکمت سمجھ رہے ہیں، حالانکہ وہ جیسا کہ تو جانتی ہے۔
ایک ظلمت ہیں، جس میں عقل بھٹک رہی ہے اور امید روپوش ہے!

اب تو جانتی ہے کہ حماقت، برائی اور ظلم کے اسباب بھی حسین ہوتے ہیں
لیکن ہم حکمت کی ظاہری سطح۔ فضیلت کے نتائج اور انصاف کے پھل کے
سوا کسی چیز میں حسن نہیں دیکھتے!

تو جانتی ہے کہ غم اور محتاجی، قلب انسانی کو پاک کرتے ہیں، لیکن ہماری
محدود عقل آسودگی اور خوشی کے سوا کسی چیز کو ہستی کے لیے موزوں نہیں سمجھتی!

اب تو جانتی ہے کہ روح زندگی کی پیچ پیچ و دشوار گزار راہوں سے تنگ
آکر نور کی طرف رواں ہے، لیکن ہم ابھی تک تیری وہی بات دہرا رہے ہیں۔
جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان نامعلوم قوت کے ہاتھ کا کھلونا ہے۔ اور بس!

تو اس رُوح کو عام کرنے پر نادم ہے، جو ہماری موجودہ زندگی کی محبت
کو ضعیف کرتی اور آنے والی زندگی کے شوق کو مارتی ہے لیکن ہم ہنوز تیرے
اقوال کو یاد رکھنے پر مُصر ہیں؟

اے ابدی عالم میں رہنے بسنے والی سلیمان کی روح! حکمت کے عاشقوں کے
دل میں یہ بات ڈال دے کہ وہ مایوسی اور بے اعتقادی کے راستوں پر نہ چلیں
کیونکہ غیر ارادی غلطی کے کفّارہ کا یہی ایک طریقہ ہے۔

مستقبل پر ایک نظر

حال کی دیواروں کے پیچھے میں نے انسانیت کے نغمہ ہائے عبودیت سُنے، گھنٹوں کی آوازیں سُنیں، جو عبادت گاہ جہاں میں آغازِ عبادت کا اعلان کرتی ہوئی ایتھر کے ذرّات کو متحرک کر رہی تھیں —— ہاں! ان گھنٹوں کی آوازیں سُنیں جنہیں قوت نے احساسات کی دھات کو پگھلا کر بنایا اور اپنے تقدس ہیکل۔ قلبِ انسانی —— پر لٹکا دیا تھا!

مستقبل کے پیچھے میں نے دیکھا کہ ایک گروہ مشرق کی طرف مُنہ کیے فطرت کے سینہ پر سر بسجدہ ہے، اور صبح —— صبح حقیقت —— کے بجوم نور کا منتظر ہے؟

میں نے تباہ شدہ شہر کو دیکھا، جس کے آثار میں سے شبنم کے اُن چند تازہ قطروں کے سوا کچھ باقی نہ تھا۔ جو لوگوں کو نور کے مقابلہ میں ظلمت کی شکست کا حال سُنا رہے تھے۔

میں نے ادھیڑ عمر کے لوگوں کو بید اور چنار کے سائے میں بیٹھے دیکھا

جن کے چاروں طرف لڑکے بیٹھے، زمانہ کے واقعات سُن رہے تھے۔
میں نے نوجوان کو دیکھا، جو سرود اور بانسری بجا رہے تھے اور نوخیز لڑکیاں، بال کھولے، اُن کے اردگرد، یاسمین کی شاخوں تلے، ناچ رہی تھیں
میں نے بوڑھوں کو دیکھا، جو کھیت کاٹ رہے ہیں اور عورتیں اناج کی ٹوکریاں اپنے سروں پر رکھے، عشرت و مسرت کے راگ گا رہی تھیں۔
میں نے عورت کو دیکھا، جو بھدّے اور بے ڈھنگے لباس کی بجائے، سر پر سوسن کا تاج رکھے ہوئے تھی اور کمر میں درختوں کے شاداب پتوں کی پیٹی باندھے ہوئے تھی۔
میں نے انسان اور دوسری مخلوق کے درمیان محبت کا رشتہ استوار پایا؛ چنانچہ پرندوں اور تتلیوں کے پرے، بے خوف ہوکر، انسان کے قریب آ رہے تھے اور ہرنوں کی ڈار اطمینان سے چشموں پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا تو فقیری تھی نہ سرمایہ داری، بلکہ اخوّت و مساوات کا دور دورہ تھا مجھے کوئی ڈاکٹر نظر نہ آیا۔ اس لیے اپنی سوجھ بوجھ کی بنا پر، ہر شخص اپنا معالج آپ تھا۔ نہ مجھے کوئی پادری دکھائی دیا، اس لیے کہ سب سے بڑا کاہن ضمیر تھا۔ وہاں کسی وکیل کا بھی وجود نہ تھا اس لیے کہ عدالت کی جگہ فطرت نے لے لی تھی اور وہی محبت اور دوستی کے عہد ناموں کی تصدیق و توثیق کر رہی تھی۔

میں نے دیکھا: انسان اس حقیقت سے آشنا ہوگیا ہے کہ وہی مخلوقات کے زاویے کا مرکز ہے اس لیے وہاں چھوٹی چھوٹی باتوں کی پرواہ نہیں کرتا اور ذلیل حرکات سے بلند ہوگیا ہے۔ اُس نے ذہنی بصیرت کی آنکھ سے شک و شبہ کے پردے بنا دیے ہیں، جس کی بناء پر وہ ان عبارتوں کو پڑھنے لگا ہے۔ جو بادل صفحۂ آسمان پر لکھتے ہیں اور نسیم کی موجیں سطحِ آب پر، اب وہ پھولوں کے انفاس کی رِم اور بُلبل اور کوئل کے نغموں کا مطلب سمجھنے لگا ہے۔

جمال کی دیواروں کے پیچھے —— مستقبل کے اسٹیج پر میں نے دیکھا کہ جمال دُولہا ہے اور روح اس کی دُلہن اور زندگی اپنے تمام متعلقات کے ساتھ اُن کی شبِ زفاف!

ملکۂ خیال

میں تدمر[1] کے کھنڈروں میں پہنچا اور تھک کر گھاس پر بیٹھ گیا، جو اُن ستونوں کے درمیان اُگی ہوئی تھی، جنہیں زمانہ نے اُکھیڑ کر گڑھوں میں پھینک دیا تھا اور جو ایسے معلوم ہوتے تھے، گویا کسی خوف ناک جنگ میں کام آنے والے سپاہیوں کے ڈھانچے ہیں۔ میں اس شہر کی بڑی بڑی عمارتوں کی تباہی پر غور کرنے لگا جو صحیح و سالم اور سرسبز آثار سے الگ مسمار ہوئی پڑی تھیں۔

جب رات ہوئی اور مختلف الجنس مخلوقات نے خاموشی کا لباس پہنے میں ساجھا کر لیا تو میں نے محسوس کیا کہ ایتھر میں جو میرا احاطہ کیے ہوئے ہے، ایک سیّال ہے، جو خوشبو میں عُود و لوبان سے اور فعل میں شراب سے مشابہ ہے، کسی نامعلوم قوت کے زیر اثر، میں نے اسے پینا شروع کر دیا اور مجھے ان مخفی ہاتھوں کا احساس ہوا، جو میری عقل کو بانٹ رہے تھے، میری میری آنکھوں کو بند کیے دیتے تھے۔ اور میری روح کو اس کی بندشوں

[1] شام کا ایک قدیم شہر (مترجم)

سے آزاد کر رہے تھے۔ اس کے بعد زمین میں تناؤ اور فضا میں لرزش کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ ایک طلسمی قوت سے مغلوب ہو کر میں نے جست لگائی اور خود کو ایک ایسے باغ میں پایا۔ جس کا تصور بھی انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ میرے ساتھ نوخیز لڑکیوں کا جمگھٹا تھا جن کا جسم حسن کے سوا ہر لباس سے عاری تھا جو میرے گرد و پیش مصروف خرام تھیں لیکن ان کے پاؤں گھاس سے مس نہ ہوتے تھے جو نغمۂ عبودیت الاپ گا رہی تھیں جس کی ترکیب محبت کے خوابوں سے ہوئی تھی۔ اور ہاتھی دانت کے سرود بجا رہی تھیں، جن کے تار سنہری تھے۔ ایک کشادہ مقام پر پہنچ کر جس کے وسط میں جڑاؤ تخت بچھا تھا اور چاروں طرف وہ منظر فریب سبزہ زار تھے جن سے قوس قزح کے رنگ کی روشنیاں پھوٹ رہی تھیں، وہ لڑکیاں دائیں بائیں کھڑی ہو گئیں، ان کی آوازوں میں مقابلتہً بلندی ہو گئی اور وہ اس سمت دیکھنے لگیں، جہاں سے عُود اور لوبان کی لپٹیں چلی آ رہی تھیں۔ اچانک پھولوں سے لدی ہوئی شاخوں میں سے ایک ملکہ نمودار ہوئی، جو آہستہ آہستہ تخت کی طرف آ رہی تھی۔ تمکنت اور وقار کی ایک عجیب شان سے وہ تخت پر جادہ افروز ہوئی اور برف کی مانند سفید کبوتروں کا جھنڈ آسمان سے اُتر کر اس کے قدموں میں بہ شکل ہلال بیٹھ گیا۔ یہ سب کچھ ہُوا، اس حال میں کہ وہ دوشیزگان جمال ملکہ کی عظمت کے راگ

گارہی تھیں از عود و لوبان کا دھواں اس کی تکریم و تعظیم کے لیے ستونوں کی طرح اُٹھ رہا تھا میں حیرت و استعجاب کا مارا ملکہ کے سامنے کھڑا، وہ کچھ دیکھ رہا تھا، جو انسان کی آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا اور وہ کچھ سُن رہا تھا جس سے ابن آدم کے کان کبھی آشنا نہیں ہوئے ۔

ملکہ نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور ہر حرکت سکون سے بدل گئی ۔ اس کے بعد ایک ایسی آواز میں جو میری روح کو اس طرح حرکت میں لے آئی، جس طرح موسیقار کے ہاتھ عود کے تاروں کو حرکت میں لے آتا ہے اور جس نے اُس طلسمی دائرہ کو اس طرح متاثر کر دیا، گویا ہر شے سراپا گوش و قلب ہے، اس نے کہا۔

"اے آدم زاد! میں نے تجھے بلایا ہے، کہ میں خیالی نزہت گاہوں کی پروردگار ہوں؛ میں نے تجھے اپنے حضور طلب کیا ہے! کہ میں خوابوں کے جنگل کی ملکہ ہوں! میری باتیں غور سے سُن کر انہیں اپنے ہم جنسوں کے سامنے بلند آواز میں دُہرائیو!

کہیو! خیال کی مملکت، خانۂ شادی ہے، جس کی دربانی ایک سرکش دیو کرتا ہے، اس مکان میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا، جب تک شادی کا لباس پہنے ہوئے نہ ہو۔

کہیوا: وہ ایک جنت ہے۔ جس کی حفاظت محبت کے فرشتے کرتے ہیں۔
اس جنت کو وہی دیکھ سکتا ہے، جس کی پیشانی پر محبت کا نشان ہو، وہ تصورات کا ایک سرسبز باغ ہے، جس کی نہریں شراب کی طرح خوشگوار ہیں، جس کے پرندے فرشتوں کی طرح اُڑتے ہیں اور جس کے پھولوں سے مشک وعنبر کی خوشبوئیں پھوٹتی ہیں۔ اس باغ میں خیال پرست کے علاوہ کوئی قدم نہیں رکھ سکتا۔

انسان سے کہیوا کہا میں نے اس سرور سے بھرا جام عطا کیا لیکن اس نے اپنی جہالت کی وجہ سے اُسے انڈیل دیا، یہ دیکھ کر ظلمت کا فرشتہ آیا اور اس جام کو افسردۂ غم سے لبریز کر گیا، وہ بدنصیب اُسے پی گیا اور مدہوش و بے خبر ہو گیا۔

کہیوا کہ سرود زندگی کو چھیڑنا صرف انہیں لوگوں کا کام ہے، جن کی اُنگلیوں نے میرے دامن کو چھُوا ہے اور جن کی آنکھ نے میرے تخت کو دیکھا ہے چنانچہ اشعیا نے اپنی حکمت کے موتی میری محبت کے رشتہ میں پروئے ہیں۔ یوحنا نے اپنا جواب میری زبان سے بیان کیا ہے اور دانتے نے عالم برزخ کی راہیں میری راہنمائی میں طے کی ہیں۔ میں وہ مجاز ہوں جس کے ڈانڈے حقیقت سے ملتے ہیں، وہ حقیقت ہوں جو روح کی وحدانیت کا اظہار کرتی ہے۔ اور وہ شاہد ہوں۔ جس سے دیوتاؤں کے اعمال میں حسن و پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔

کہبوا فکر کے لیے اس مادّی عالم سے باہر ایک اور عالم ہے جس کے آسمان کو سرود کے بادل مکدّر نہیں کرتے اور تخیلات کے لیے دیوتاؤں کے آسمان پر بنی ہوئی کچھ تصویریں ہیں، جن کا عکس روح کے آئینہ پر پڑتا ہے۔ اُن عشرتوں کی اُمید کو عام کرنے کے لیے جو اُسے دنیوی زندگی سے چھٹکارا پانے کے بعد حاصل ہوں گی۔"

ملکہ خیال نے سحر آفریں نگاہوں سے مجھے اپنی طرف کھینچا اور میرے بھڑکتے ہوئے ہونٹوں کو بوسہ دے کر کہنے لگی ۔

"کہبوا کہ جو کوئی اپنے شب و روز خیال و خواب کی دُنیا میں بسر نہیں کرتا وہ شب و روز کا غلام رہتا ہے۔"

اس وقت دوشیزگان جمال کی آوازیں اُونچی ہوئیں، عود و لوبان کا دُھواں بلند ہُوا اور خواب میری نگاہوں سے چھپ گیا۔ زمین میں تناؤ کی سی اور فضا میں لرزش کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ اب پھر اتیس غم آفریں کھنڈروں میں تھا۔

صبح مسکرا رہی تھی اور میری زبان اور ہونٹوں پر یہ کلمے تھے۔

"جو کوئی اپنے شب و روز خیال و خواب کی دُنیا میں بسر نہیں کرتا، وہ شب و روز کا غلام رہتا ہے!"

اے ملامتِ کار

اے ملامت کار! مجھے تنہا چھوڑ دے۔

میں تجھے اس محبت کی قسم دیتا ہوں، جو تیری روح کو تیری محبوبہ کے جال میں مجذب کرتی ہے، تیرے دل کو تیری ماں کی شفقت کی زنجیر میں جکڑتی ہے اور تیرے پدرانہ جذبات کو تیرے بیٹے سے وابستہ کرتی ہے۔ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دے!

مجھے اور میرے خوابوں سے کوئی واسطہ نہ رکھ اور کل تک کے لیے صبر کر! کل جو چاہے گا، میرے متعلق فیصلہ کر دے گا۔

تو نے نصیحتوں سے اپنا خلوص ظاہر کیا، لیکن نصیحت ایک سایہ ہے جو روح کو حیرت کے سبزہ زار میں لے جاتا ہے، اس مقام کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ جہاں زندگی مٹی کی طرح جامد ہے۔

میرا دل چھوٹا سا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اسے سینہ کی تاریکی سے نکال کر اپنی ہتھیلی پہ رکھوں اور اس کی گہرائیوں کا اندازہ کروں اس کے اسرار کا

کھوج لگاؤں! اس لیے اے ملامت کار! اپنے اعتقادات کے تیروں سے اس کی نگرانی نہ کر! اسے خوف زدہ کر کے، پسلیوں کے پنجرہ میں چھپے رہنے پر مجبور نہ کر! جب تک کہ وہ اپنے اسرار کا خون نہ بہالے، اپنا فرض پورا نہ کر لے، جو دیوتاؤں نے اُسے حسن و محبت کی آمیزش سے پیدا کرتے وقت اس کے ذمہ عائد کیا تھا۔

سورج نکل آیا اور بلبل ہزار داستان چہکنے لگی۔ آس[1] اور منشور[2] کی خوشبوئیں فضا میں پھیل گئیں۔ میں چاہتا ہوں کہ نیند کے لحاف سے نکل کر سفید بھیڑوں کے ساتھ چلوں! اس لیے اے ملامت کار! تو مجھے نہ روک! جنگل کے شیروں اور وادی کے سانپوں سے مجھے نہ ڈرا! کہ میری روح خوف نہیں جانتی اور کسی بُرائی سے پیش از وقت نہیں ڈرتی۔

اے ملامت کار مجھے چھوڑ دے اور نصیحت نہ کر! اس لیے کہ مصائب نے میری چشم بصیرت کو وا کر دیا ہے آنسوؤں نے میری بصارت کو چمکا دیا ہے اور غم نے مجھے دلوں کی زبان سکھا دی ہے۔

ممنوعات کا ذکر چھوڑ! کہ میرے ضمیر کی عدالت مجھ پر منصفانہ احکام صادر کرتی ہے۔ اگر میں بے گناہ ہوں گا۔ تو وہ مجھے سزا سے بچائے گی اور

---

[1] ولایتی مہندی [2] ایک خوشبودار نباتات

اگر میں مجرم ہوں گا۔ تو ثواب سے محروم کر دے گی۔

دیکھو! محبت کا جلوس جا رہا ہے، حسن اپنے جھنڈے بلند کیے اس کے ساتھ ہے اور جوانی خوشی کے بگل بجا رہی ہے!! مجھے نہ روک! اے ملامت کار! بلکہ جانے دے!! کہ راستوں پر گلاب اور چنبیلی کے پھول بچھے ہیں اور فضا مشک کی خوشبو سے بسی ہے۔

دولت کی کہانی اور عظمت کے قصّے نہ سُنا! کہ میرا نفس اپنی قناعت کی بناء پر بے نیاز اور دیوتاؤں کی عظمت و بزرگی کی پرستش میں محو ہے۔

سیاست کی باتوں اور اقتدار کی خبروں سے مجھے معاف رکھ! کہ ساری زمین میرا وطن ہے اور تمام انسان میرے ہم وطن ہیں۔

کاناپھوسی

اس وقت تو کہاں ہے؟ اے میری حسینہ!

کیا اپنی چھوٹی سی جنّت میں اُن پھولوں کا رَس چُوس رہی ہے۔ جو مجھ سے محبّت کرتے ہیں، جس طرح بچّہ اپنی ماں کی چھاتیوں سے محبّت کرتا ہے؟ یا اپنے خلوت کدہ میں ہے، جہاں تو نے پاکیزگی کے لیے ایک قربان گاہ بنائی ہے اور میری روح اور اس کی باقی ماندہ قوتوں کو اس پر بٹھا دیا ہے؟ یا اپنی کتابوں میں گُم ہے۔ جن کے ذریعے تو حکمتِ انسانی سے بڑھ کر کچھ چاہتی ہے، حالانکہ تو دیوتاؤں کی حکمت سے مالا مال ہے؟

تو کہاں ہے؟ اے میری من موہنی! کیا ہیکل میں میرے لیے عبادت کر رہی ہے؟ یا باغ میں اپنے انوکھے تصوّرات کی چراگاہ کے متعلق فطرت سے سرگوشیاں کر رہی ہے؟ یا غریبوں کی جھونپڑیوں میں اپنی روح کی مٹھیاں بھر رہی ہے؟

تو ہر جگہ ہے، اس لیے کہ تو روحِ خداوندی کا ایک جزو ہے! تو ہر وقت ہے، اس لیے کہ تو زمانہ سے قوی ہے!

کیا تو اُن راتوں کو یاد کر رہی ہے ۔ جن میں ہم ایک جگہ جمع ہوئے تھے ۔ تیرے نفس کی شعاعیں ہالہ کی طرح ہمیں گھیرے ہوئے تھیں اور محبت کے فرشتے روح کے کارناموں کا راگ گاتے ہوئے ، ہمارا طواف کر رہے تھے ؟

کیا تو ان دنوں کو یاد کر رہی ہے ، جن میں شاخوں کے سائے بیٹھے تھے اور وہ ہم پر اس طرح سایہ فگن تھیں ، گویا ہمیں انسان کی نگاہوں سے چھپائے رہتے ہیں ؟

کیا تو ان راستوں اور ڈھلانوں کو یاد کر رہی ہے ۔ جن پر ہم چلتے تھے تیری انگلیاں میری انگلیوں سے اس طرح پیوست ہوتی تھیں ، جیسے تیری چوٹیوں کے بال ایک دوسرے سے پیوست ہیں اور ہم اپنے سر اس طرح جوڑ لیتے تھے گویا خود کو خود سے بچانا چاہتے ہیں ۔

کیا تو وہ ساعت یاد کر رہی ہے ؛ جب میں تجھ سے رخصت ہونے آیا تھا اور تو نے گلے لگا کر میرا الوداعی بوسہ لیا تھا ۔ جس سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ چاہنے والوں کے ہونٹ جب آپس میں ملتے ہیں تو ایسے بلند اسرار ظاہر ہوتے ہیں ، جنہیں زبان نہیں جانتی ـــــ وہ بوسہ ، جو دُہری آہ کا پیش خیمہ تھا اور وہ آہ اس روح سے مشابہ ، جیسے اللہ نے مٹی میں پھونکا اور اُس مٹی سے انسان بن گیا ! یہی آہ ہماری عظمتِ نفس کا اعلان کرتی ہوئی ہمیں

روحوں کی دُنیا میں لے گئی، جہاں وہ اس وقت تک رہے گی۔ جب تک ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے نہ جا ملیں۔

اس کے بعد تو نے مجھے پھر پیار کیا، پھر پیار کیا، پھر پیار کیا اور اس طرح کہ آنسو تجھے سہارا دے رہے تھے۔ تو نے کہا۔

"اجسام کے مقاصد ناقابلِ اختتام ہیں۔ وہ دنیوی معاملات پر قطع تعلق کر لیتے ہیں اور مادّی اغراض پر لڑتے جھگڑتے ہیں۔ لیکن ارواح سکون و اطمینان کے ساتھ محبت کے سائے میں رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ موت آتی ہے اور انہیں خدا کے حضور لے جاتی ہے!

جا! میرے حبیب! زندگی نے تجھے پکارا ہے، اس کی آواز پہ جا!! کیونکہ وہ ایک حسینہ ہے، جو اپنے فرماں بردار دل کو لذّت و عشرت کی کوثر کے بھرے ہوئے جام پلاتی ہے! رہی میں، سو میری بالکل فکر نہ کرنا کہ تیرا عشق! میرے لیے کبھی نہ جدا ہونے والا دولھا ہے اور تیری یاد، کبھی نہ ختم ہونے والی مبارک شادی!

اب تو کہاں ہے؟ اے میری رفیقۂ حیات! کیا تو رات کی خاموشی میں اس نسیم کے لیے جاگ رہی ہے، جو تیری طرف جب کبھی جاتی ہے، میرے دل کی دھڑکنیں اور میرے سینے کے بھید لے کر جاتی ہے؟ یا اپنے محبوب کی تصویر

کو دیکھ رہی ہے، جو صاحب تصویر سے بالکل نہیں ملتی۔ کیونکہ غم نے اس کی پیشانی کو سکیڑ دیا ہے، جو کل تک تیرے قرب کی وجہ سے کشادہ تھی، گریہ و زاری نے اُن آنکھوں کو بے نور کر دیا ہے، جو تیرے جمال کے اثر سے سُرمہ آلود تھیں۔ اور دل کی آگ نے اُن ہونٹوں کو خشک کر دیا ہے، جو تیرے بوسوں سے تر رہتے تھے۔

تو کہاں ہے؟ اے میری محبوبہ! کیا تو سات سمندر پار سے میری پکار اور نالہ و فریاد سُن رہی ہے، میری ذلت و بے چارگی کو دیکھ رہی ہے۔ میرے صبر و تحمل کا اندازہ کر رہی ہے؟ کیا فضا میں وہ روحیں نہیں ہیں، جو ایک درد و کرب سے تڑپتے ہوئے جاں بلب کے انفاس لے جاتی ہیں؟ کیا دونوں کے درمیان وہ مخفی رشتے نہیں ہیں، جو قریب المرگ عاشق کا شکوہ اس کی محبوبہ تک پہنچا سکیں؟

تو کہاں ہے؟ میری زندگی! ظلمت نے مجھے اپنی آغوش میں کھینچ لیا ہے اور مایوسی مجھ پر غالب آگئی ہے!! فضا میں مسکرا کہ مجھ میں حرکت پیدا ہو ایتھر میں سانس لے کہ میں پھر زندہ ہو جاؤں!!

تو کہاں ہے؟ میری محبوبہ! تو کہاں ہے؟؟

آہ! کتنی عظمت مآب ہے محبت اور کتنا بے بضاعت ہوں میں!!

مُجرم

ایک نوجوان سرِ راہ بیٹھا بھیک مانگ رہا تھا۔ قوی الجثّہ نوجوان جسے بھوک نے بے جان کر دیا تھا، اور وُہ سڑک کے موڑ پہ آنے جانے والوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا، منھ سے گڑگڑا کر سوال کر رہا تھا، اپنی ذلّت و بدبختی کی کہانی دُہرا رہا تھا: بھُوک کی تکلیفوں کا دُکھڑا رو رہا تھا۔

رات نے اپنا پرچم گاڑ دیا۔ نوجوان کے ہونٹ خشک ہو گئے اور زبان زخمی، لیکن ہاتھ پیٹ کی طرح خالی کا خالی ہی رہا۔

وُہ اُٹھا اور شہر کے باہر چلا گیا۔ وہاں درختوں کے جھُنڈ میں بیٹھ کر وہ زار و قطار رونے لگا۔ اس نے اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں جن پر آنسوؤں کا پردہ پڑا تھا۔ اس عالم میں کہ بھوک اس کا کلیجہ کھُرچے لیتی تھی، اُس نے کہا:

"خُدایا! میں سیٹھ کے ہاں کام کی تلاش میں گیا، لیکن میرے بدن پر لیرے لگے دیکھ کر اس نے مجھے نکلوا دیا۔ میں نے اسکول کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن خالی ہاتھ ہونے کی وجہ سے مجھے گھُسنے نہ دیا گیا۔ صرف دو وقت کی روٹی پر میں

نے نوکری کرنی چاہی، لیکن میری بدقسمتی کہ اس سے بھی محروم رہا۔ مجبور ہو کر بھیک مانگنے کی کوشش کی، لیکن یا رب! تیرے بندوں نے میری طرف دیکھا اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ "یہ موٹا مُسٹنڈا ہے، ایسے حرام ہڈ کو بھیک دینا جائز نہیں"۔

یا رب! مجھے میری ماں نے تیرے حکم سے جنا اور اب میں تیرے وجود کی بنا پر زندہ ہوں! پھر لوگ مجھے روٹی کا ٹکڑا کیوں نہیں دیتے جبکہ میں تیرے نام پر مانگتا ہوں؟

غم زدہ نوجوان کا چہرہ متغیر ہو گیا اور آنکھیں شعلوں کی طرح چمکنے لگیں۔ وہ اٹھا اور خشک شاخوں میں سے ایک موٹی سی ٹہنی اٹھائی، پھر اس سے شہر کی طرف اشارہ کیا اور بلند آواز سے چلایا۔

میں نے ماتھے کے پسینہ کے عوض زندگی طلب کی، لیکن اُسے نہ پایا اب میں اُسے اپنے بازوؤں کی قوت سے حاصل کروں گا! میں نے محبت کے نام پر روٹی مانگی لیکن انسان نے کوئی توجہ نہ کی، اب میں ظلم و سرکشی کے نام پر روٹی ہی نہیں بلکہ اور بہت کچھ اس سے لوں گا۔ اور وہ دینے پہ مجبور ہوگا!

ایک زمانہ گزر گیا۔ نوجوان ہاروں کے لیے برابر گردنیں کاٹتا اور

اپنے لالچ کے محل تعمیر کرنے کے لیے مسلسل روحوں کے ہیکل مسمار کرتا رہا یہاں تک کہ اس کی دولت بے اندازہ اور شجاعت علم ہو گئی۔ ملک کے ڈاکو اس کو محبوب دیکھنے لگے اور حکومت کے ارکان اس کے نام سے ڈرنے لگے۔ انجام کار بادشاہ نے اس شہر میں اسے اپنا نائب بنا دیا اور اپنے معتمدین کے حلقہ میں شامل کر کے اسے منصب امارت پر فائز کر دیا۔

اس طرح انسان اپنی کنجوسی سے مسکین کو بدمعاش اور اپنی سنگدلی سے امن پسند کو قاتل بناتا ہے!

رفیقۂ حیات

پہلی نظر

یہ وہ ساعت ہے، جو زندگی کی بے خبری اور ہوشیاری کے درمیان خطِ فاصل ہے۔ یہ وہ اوّلین شعلہ ہے جو زندگی کی خلاؤں کو روشن کر دیتا ہے۔ یہ سرودِ قلبِ انسانی کے پہلے تار کی پہلی طلسمی جھنکار ہے۔ وہ مختصر سا لمحہ ہے، جو گوشِ روح میں بیتتے ہوئے دنوں کے واقعات دہراتا ہے، اس کی بصارت پر اعمالِ شب و صبح کرتا رہتا ہے، اس کی بصیرت کو اس دنیا کے وجدانی کارناموں سے آگاہی بخشتا ہے اور آنے والے عالم کی دائمی زندگی کا راز اس پر فاش کرتا ہے۔ یہ وہ بیج ہے جسے عشتروت[1] بلندی سے پھینکتی ہے اور آنکھیں دل کے کھیت میں ڈال دیتی ہیں

---

[1] عشتروت، فینیقیا اور لبنان کے قدیم باشندوں کے نزدیک حسن و محبت کی دیوی ہے۔ یہی ہے جسے یونانی افرودائتی کے نام سے پکارتے ہیں اور رومی وینس کے نام سے (جبران)

جذبات اس بیج کو سینچتے ہیں اور روح اس کے پھل کھاتی ہے۔

محبوبہ کی پہلی نظر اس روح سے مشابہ ہے، جو اتھاہ سمندر کی سطح پر منڈلایا کرتی تھی اور جس سے زمین و آسمان پیدا ہوئے ہیں۔

رفیقۂ حیات کی پہلی نظر خدا کے قول "کن" کی مانند ہے!

پہلا بوسہ

یہ اس جام کا پہلا گھونٹ ہے۔ جسے دیوتاؤں نے محبت کی شراب سے لبریز کیا تھا۔ یہ شک — جو دل کو بہکا سکھا کر اُسے غمگین کرتا ہے۔ اور یقین — جو دل کی خلاؤں کو پُر کر کے اُسے مسرت بخشتا ہے کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ یہ روحانی زندگی کے قصیدہ کا مطلع اور معنوی انسان کی داستانِ حیات کا پہلا باب ہے۔ یہ وہ حلقہ ہے جو ماضی کے دھندلکے کو مستقبل کی روشنی سے ہم رشتہ اور احساسات کی خاموشی کو اُن کے نغموں سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہ وہ کلمہ ہے۔ جسے چار ہونٹ دل کے تخت، محبت کے بادشاہ اور وفا کے تاج ہونے کا اعلان کرتے ہوئے ادا کرتے ہیں۔ یہ وہ لطیف لمس ہے، جو گلاب کی پتیوں پر سے، نسیم کی انگلیوں کے گذرنے سے مشابہت رکھتا ہے — وہ انگلیاں جن کی گرفت میں طویل و لذیذ آہیں اور مخفی و شیریں کراہیں ہیں یہ ان طلسمی لرزشوں کا آغاز

ہے جو وہ چاہنے والوں کو اس جہانِ آب و گِل سے نکال کر وحی اور خوابوں کی دُنیا میں لے جاتا ہے۔ یہ گُلِ لالہ کا گُلِ انار سے اتحاد اور ایک تیسرے نئے وجود کے لیے ان کا باہمی ازدواج ہے۔

اگر پہلی نظر اُس بیج سے مماثلت رکھتی ہے، جسے محبت کی دیوی قلبِ انسانی کے میدان میں ڈالتی ہے تو پہلا بوسہ شجرِ حیات کی پہلی شاخ کے کنارے کے پہلے پھول سے مشابہت رکھتا ہے۔

وصال

یہاں محبت زندگی کے منتشر اجزاء کو جمع کرنا شروع کرتی ہے۔ اور مطالبِ زندگی کے زیرِ اثر ان صورتوں کی شکل میں نمو پاتی ہے۔ جنہیں دن خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے اور راتیں ترنم سے دُہراتی ہیں۔

یہاں شوق زمانۂ گزشتہ کی چیستانوں سے مشکلات کے پردے اُٹھاتا ہے اور لذتوں کے اجتماع سے وہ سعادت پیدا کرتا ہے۔ جس پر کسی کو امتیاز حاصل نہیں، سوائے نفس کی سعادت کے، جب وہ اپنے پروردگار سے ہم آغوش ہو جائے!

وصال زمین پر ایک تیسری اُلوہیت کو وجود پذیر کرنے کیلئے دو الوہیتوں کا اتحاد ہے وہ کمزور زمانہ کے بغض و عناد کا مقابلہ کرنے کے لیے دو طاقتور

ہستیوں کا اپنی محبت کے ذریعہ بیمانِ ہمدوشی ہے۔ وہ قرمزی شراب میں زرد شراب کی آمیزش ہے تاکہ اس سے وہ نارنجی[1] شراب وجود میں آئے جو شفق صبح کے رنگ سے ملتی جلتی ہے۔ وہ دو روحوں کی نفرت سے نفرت اور اتحاد سے اتحاد ہے۔ وہ اس زنجیر کی سنہری کڑی ہے۔ جس کا پہلا سرا نگاہ ہے اور آخری سرا سرمدیت۔ وہ پاک آسمان سے فطرت کی مقدس زمین پر شفاف بادلوں کی تراوش ہے تاکہ کھیتوں کی مبارک قوتیں ابھریں۔

اگر محبوبہ کے چہرے پر پہلی نگاہ اس بیج کی مثال ہے، جسے محبت دل کے کھیت میں ڈالتی ہے اور اس کے لبوں کا پہلا بوسہ شاخِ حیات کے پہلے پھول کی مانند، تو وصال پہلے بیج کے پہلے پھول کا پہلا پھل ہے۔

[1] نارنجی رنگ کیمیاوی طور پر سرخ اور زرد رنگ سے پیدا ہوتا ہے۔ (جبران)

سعادت کا گھر

میرا دل میرے سینہ میں اکتا گیا اور مجھے چھوڑ کر سعادت کے گھر کی طرف چلا گیا۔ اس حرم میں پہنچ کر جسے نفس نے مقدس کیا ہے وہ حیران و پریشان کھڑا ہو گیا، اس لیے کہ وہاں اس نے وہ چیزیں نہیں دیکھیں جن کا تصور وہ اب تک کرتا رہا تھا۔ اسے وہاں قوت، مال، اقتدار کچھ نظر نہ آیا۔ وہاں اس نے حسن کے نوجوان پیکر اس کی بیوی — محبت کی بیٹی — اور ان کی بچی حکمت کے سوا کسی کو نہ پایا۔

میرے دل نے محبت کی بیٹی سے پوچھا۔

"محبت! قناعت کہاں ہے، میں نے تو یہ سنا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ اس گھر میں رہتی ہے؟"

اس نے جواب دیا:

"قناعت پند و نصیحت کے لیے شہر میں گئی ہے۔ جہاں حرص و طمع کا دور دورہ ہے۔ ہم اس کے محتاج نہیں! سعادت کو قناعت کی بالکل

خوامش نہیں، اس لیے کہ سعادت وہ شوق ہے جس سے وصال ہم آغوش ہے اور قناعت وہ بہلاوا جو نسیان و فراموشی کی زد میں ہے۔ مری رُوح کبھی مطمئن نہیں ہوتی، اس لیے کہ وہ کمال کو چاہتی ہے اور کمال ایک سلسلہ ہے — لامتناہی اور غیر منتتم سلسلہ!

اب میرے دل نے حسن کے نوجوان پیکر سے سوال کیا: "جمال! مجھے عورت کا راز سمجھا کہ تو ہی معرفت ہے"!

اس نے جواب دیا: "عورت تو ہے! اے قلبِ انسانی! جو تیری کیفیت ہے، وہی اس کی بھی کیفیت ہے! عورت میں ہوں۔ جہاں کہیں میں ہوتا ہوں وہ بھی وہیں ہوتی ہے۔ عورت مذہب ہے، اگر جاہلوں نے اس میں کوئی تحریف نہ کی ہو۔ وُہ ماہِ کامل ہے، اگر بادلوں نے اُسے روپوش نہ کر دیا ہو، وہ نسیم ہے اگر اس کا دامن شر و فساد کے دھبوں سے پاک و صاف ہو"۔

اب میرا دل حسن و محبت کی بیٹی — حکمت کے پاس گیا اور اس سے کہا: "مجھے حکمت عطا کر کہ میں اُسے انسان کے پاس لے جاؤں"۔

اس نے جواب دیا: "انسان سے کہہ دے: کہ حکمت وہ سعادت ہے۔ جو اس کے نفس کی انتہائی پاکیزگیوں میں جنم لیتی ہے، نہ وہ کہ خارج سے آتی ہے"!

دیارِ ماضی

زندگی نے مجھے جوانی کے پہاڑ کے دامن میں کھڑا کر دیا اور پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک عجیب و غریب وضع کا شہر نظر آیا جو ایک ہموار زمین کی چھاتی پر آباد تھا۔ اس شہر میں مختلف قسم کی پرچھائیاں اور رنگ برنگ کے بخارات گردش کر رہے تھے اور اس پر ایک ایسی لطیف کہر کی نقاب پڑی تھی جو قریب تھا کہ اسے نگاہوں سے اوجھل کر دیتی۔

میں نے پوچھا:

"زندگی! یہ کیا ہے؟

اس نے کہا:

"غور سے دیکھ: یہ دیارِ ماضی ہے"!

میں نے غور سے دیکھا تو مجھے نظر آیا: اعمال کے مدارس نیند کے بازوؤں تلے دیووں کی طرح بیٹھے ہیں۔ اقوال کی مسجدیں مایوسی کی چیخیں مارتی اور امید کے راگ گاتی اس کا طواف کر رہی ہیں۔ مذہب کے ہیکلوں کو کبھی کبھی یقین تعمیر کرتا

ہے اور کبھی شک و ارتیاب ڈھا دیتا ہے۔ افکار کے مینار آسمان کی طرف اس طرح بلند ہیں، گویا بھک منگوں کے ہاتھ ہیں۔ امیدوں کے راستے اس طرح پھیلے چلے گئے ہیں جیسے ٹیلوں کے درمیان دریا۔ اسرار کے خزانے جن کی حفاظت رازداری کر رہی تھی، شوقِ دریافت کے ڈاکوؤں نے لوٹ لیے ہیں۔ سبقت و پیش قدمی کے قلعوں میں جنہیں شجاعت نے بنایا تھا، خوف و ہراس نے شگاف ڈال دیے ہیں۔ خوابوں کے محل جنہیں راتوں نے سجایا تھا؛ بیداری نے ویران کر دیے ہیں۔ جھوٹی جھوٹی جھونپڑیاں، کمزوری کا مسکن ہیں۔ تنہائی کی یونیورسٹیوں میں انکارِ ذات براجمان ہے؛ علوم و فنون کی محفلیں، جنہیں عقل نے روشن کیا تھا، جہل کے ہاتھوں تاریک ہو گئی ہیں۔ محبت کے شرابِ خانوں میں عاشق بے ہوش پڑے ہیں اور غفلت و بے خبری ان کا مذاق اُڑا رہی ہے۔ انسانی عمر کے اسٹیج پر، جو کبھی زندگی کے ڈراموں کی نمائش کے لیے وقف تھا، موت نے آکر اپنی ٹریجیڈی ختم کر دی ہے؟

یہ دیارِ ماضی ہے، جو دور بھی ہے اور نزدیک بھی ——— نگاہوں کے سامنے بھی ہے، اور اُن سے روپوش بھی۔

زندگی نے قدم اُٹھایا اور کہنے لگی:

"بس اب اُٹھو! بہت دیر ہو گئی!!

میں نے پوچھا:

"زندگی: اب کہاں کا ارادہ ہے"؟

اس نے جواب دیا:

"مستقبل کے شہر کا"!

میں نے درخواست کی:

"تھوڑی دیر اور تھم جا! کہ میں چلتے چلتے تھک گیا ہوں، چٹانوں نے میرے پاؤں کو زخمی اور دشوار گزار راستوں نے میری قوتوں کو شل کر دیا ہے"!

زندگی نے جھنجھلا کر کہا:

"اُٹھ اور چل کہ ٹھہرنا بزدلی ہے اور دیارِ ماضی کو دیکھنا جہالت"!

ملاقات

جب رات آسمان کے لباس میں تاروں کے جواہر ٹانک چکی تو وادیِ نیل سے ایک پری اپنے غیر مرئی پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے بلند ہوئی اور بحیرۂ روم پر چھائے ہوئے ان بادلوں کے تخت پر بیٹھ گئی جو چاند کی شعاعوں سے نقرئی معلوم ہو رہے تھے۔ فضا میں تیرتی ہوئی روحوں کا ایک جھلڑ اس کے سامنے سے گزرا جو بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔

"پاک ہے! پاک ہے! پاک ہے! مصر کی وہ بیٹی، جس کی عظمت سارے خطۂ ارض کو محیط ہے"!!

اس چشمہ کے منبع کی بلندیوں سے جو صنوبری جھنڈ کو گھیرے ہوئے تھا، ایک نوجوان کا سایہ ساٹ[1] و فیم کے ہاتھوں میں لپٹا ہوا ابھرا، اور پری کے پہلو میں تخت پر بیٹھ گیا۔ روحیں پھر آئیں اور یہ چلاتی ہوئی ان کے سامنے سے گزر گئیں:

---

[1] ایک فرشتہ کا نام ہے۔ (مترجم)

"پاک ہے! پاک ہے! پاک ہے۔ لبنان کا نوجوان جس کی زندگی سے زمانہ لبریز ہے"!

جب عاشق نے محبوبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تو موجوں اور ہواؤں نے ان کی اس سرگوشی کو دُنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا۔

"السّسس کی بیٹی! میرا نیرا حسن کس قدر کامل ہے، اور میری محبت کتنی بے پناہ"!

"عشروت کے بیٹے! تو نوجوانوں میں کتنا حسین ہے، اور میرا جذبۂ شوق کس درجہ وافر"!

"میری محبت تیرے اہرام کی مثال ہے، میری محبوبہ! جسے زمانہ مسمار نہیں کر سکتا"!

"اور میری محبت تیرے صنوبر کے درختوں سے مشابہ ہے، میرے حبیب! جس پر عناصر غلبہ نہیں پا سکتے"!

"مختلف اقوام کے فلسفی مشرق و مغرب سے آتے ہیں، میری محبوبہ! تاکہ تیری حکمت سے نفع اندوز ہوں اور تیرے اسرار و رموز معلوم کریں"۔

"دُنیا کی بڑی بڑی ہستیاں مختلف ملکوں سے وارد ہوتی ہیں، میرے حبیب

تاکہ تیرے جمال کی شراب سے مخمور اور تیرے معانی کے طلسم سے مسحور ہوں"!

"میری پیاری! تیری ہتھیلی ان بے شمار نیکیوں کا کھیت ہے، جن سے مودی خانے بھر جاتے ہیں۔

میرے پیارے! تیرے بازو شیریں پانی کا چشمہ ہیں اور تیرے سانس نشاط آفریں ہوائیں"!

"نیل کے محل اور ہیکل، میری پیاری! تیری عظمت کا ڈنکا بجاتے ہیں اور ابوالہول تیری بزرگی کی داستان سناتا ہے"!

"تیری چھاتی کے پرصنوبری درخت، میرے پیارے! تیری شرافت و نجابت کی نشانیاں ہیں اور تیرے گرد و پیش کے یہ قلعے تیری عظمت و شجاعت کے ترجمان"!

"آہ! میری محبوبہ! کتنی حسین ہے تیری محبت! اور کتنی شیریں ہے وہ امید جو تیرے ارتقاء سے وابستہ ہے!!

"آہ تو کتنا محترم دوست اور کتنا وفادار شوہر ہے۔ تیرے تحفے کتنے حسین اور تیری بخششیں کتنی نفیس ہیں! تو نے میرے پاس ان نوجوانوں کو بھیجا، جو گہری نیند کے بعد کی بیداری تھے۔ تو نے مجھے تحفہ میں وہ شہسوار عطا کیا جو میری قوم کی کمزوری پر غالب آ گیا۔ تو نے ہدیہ کے طور پر مجھے وہ

ادب دیا جس نے میری قوم کو بیدار کیا اور وہ عجیب مرحمت فرمایا جس نے اس کی غیرت قومی کو بھڑکایا۔"

"میں نے تیرے پاس بیج بھیجے اور تو نے انہیں پھول بنا دیا۔ میں نے تیرے پاس پودے بھیجے اور تو نے انہیں درخت بنا دیا۔ تو وہ انجھوتا باغ ہے میری پیاری! جو گلاب اور سوسن میں جان ڈالتا ہے، سرو اور صنوبر کو بلندی عطا کرتا ہے۔"

"مجھے تیری آنکھوں میں غم نظر آرہا ہے میرے حبیب! کیا تو میرے پہلو میں ہوتے ہوئے بھی غمگین ہے؟"

"میرے بیٹے سات سمندر پار چلے گئے ہیں اور میری رفاقت کے لیے نالۂ و ماتم اور غم گساری کے لیے شوق و بے قراری چھوڑ گئے ہیں!"

"میرے پیارے کاش! مجھے بھی تیرے ہی جیسا غم مل جاتا اور خوف و ہراس کا کوئی اثر میرے دل پر باقی نہ رہتا!"

"نیل کی بیٹی! کیا تو قوموں کی پیاری ہوتے ہوئے بھی خوف زدہ ہے؟"

"میں اس شیطانی جماعت سے ڈرتی ہوں، جو اپنی مکاریوں کی حلاوت کے ذریعے میرے قریب آرہی ہے، جو اپنے بازوؤں کی قوت سے میری باگیں سنبھال رہی ہے۔"

"اقوام کی زندگی، میری پیاری! افراد کی زندگی سے مشابہ ہے۔ اس زندگی سے جسے امید عزیز رکھتی ہے، جس سے قوت قریب ہے، جس کے گرد آرزوئیں منڈلاتی ہیں اور جس پر مایوسی نگاہیں جمائے رہتی ہے!"

محبت و محبوب ہم آغوش ہو گئے اور بوسوں کے پیالوں میں معطر شراب پینے لگے۔ اسی دوران روحوں کا جھگڑا گاتے ہوئے گزرا۔

"پاک ہے! پاک ہے! پاک ہے! وہ محبت، جس کی عظمت و بلندگی نے زمین و آسمان کو گھیر رکھا ہے۔"

دلوں کے بھید

ایک شاندار محل میں — جو رات کے بازوؤں تلے اس طرح کھڑا تھا۔ جیسے زندگی موت کے پردوں میں — ہاتھی دانت کی میز کے پاس ایک حسینہ بیٹھی تھی۔ اس کا حسین سر، اس کے ہاتھ پر۔ اس طرح ٹکا تھا جیسے مرجھایا ہُوا چنبیلی کا پھول پتوں پر پڑا ہو۔ وہ اپنے گرد و پیش اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے کوئی مایوس قیدی، زندگی کو آزادی کے جلوس کے ساتھ چلتے ہوئے دیکھنے کے لیے، قید خانہ کی دیواروں میں اپنی نگاہوں سے شگاف ڈال دینا چاہتا ہے

وقت ظلمت کی پرچھائیوں کی طرح گزرتا رہا اور وہ اپنے آنسوؤں میں کھوئی اپنی تنہائی اور غم میں محو بیٹھی رہی، یہاں تک کہ جذبات کے قدم اس کے دل پر تیز ہو گئے اور احساسات نے اس کے بھیدوں کے خزانے پر قابو پا لیا۔ اس نے قلم اٹھایا اور کاغذ کے سادہ صفحات پر روشنائی کے قطروں کو اپنے آنسوؤں میں آمیز کرنے لگی، اپنی روح کے اسرار کو حروف و الفاظ کا لباس پہنانے لگی اس نے لکھا:

"پیاری بہن!"

دل جب اپنے اسرار سے تنگ آجاتا ہے، پلکیں جب آنسوؤں کی حرارت سے زخمی ہوجاتی ہیں اور پسلیاں جب سینے کے بھیدوں کی زیادتی سے پھٹنے لگتی ہیں تو کلام اور شکوہ و شکایت کے سوا، آدمی کے لیے کوئی چارہ کار نہیں رہتا یہی وجہ ہے، پیاری بہن! کہ غم کے مارے کو شکوہ و شکایت میں راحت ملتی ہے عاشق کو اپنے محبوب کی شان میں شعر پڑھنے سے سکون حاصل ہوتا ہے اور مظلوم رحم طلبی میں لذت محسوس کرتا ہے۔

اس وقت میں یہ خط نہیں اس لیے لکھ رہی ہوں کہ میری کیفیت اس شاعر کی سی ہوگئی ہے، جو اشیائے عالم کے حسن کو دیکھتا ہے اور اپنی غیر فانی قوت سے مجبور ہو کر اس حسن کی تاثیرات کو نظم کرنا شروع کر دیتا ہے یا پھر یوں کہہ لو کہ میں اس غریب اور بھوکے بچے کی مثال ہوگئی ہوں، جو اپنی ماں کی بیچارگی اور فاقہ پر رحم نہیں کھاتا اور بھوک کی تکلیف سے بے چین ہو کر چلّانے لگتا ہے۔

بہن! میری دردناک کہانی سنو اور میرے حال پر جی کھول کے آنسو بہاؤ! کہ گریہ وزاری عبادت کی مثال ہے اور مہربانی کے آنسو احسان کی، جن کا ہو کبھی علاج نہیں ہوتا اس لیے ضائع نہیں ہوتا کہ وہ زندہ اور حساس روح کی گہرائیوں سے اُبلتے ہیں۔"

ہر دولت مند اور شریف باپ کی طرح، جو غریبی کے خوف اور زمانہ کی گردشوں کے ڈر سے چاہتا ہے کہ دولت کا دامن دولت کے دامن سے اور شرافت کا دامن شرافت کے دامن سے باندھ دے، میرے والد نے بھی اپنی مرضی سے مجھے ایک دولت مند اور شریف مرد کے پلے باندھ دیا۔ بالفاظ دیگر میں اپنے تمام جذبات و تصورات کے ساتھ زر و جواہرات موروثی شرافت کی اس قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دی گئی، جس سے مجھے نفرت ہے، ایک بے زبان شکار کی طرح اس مادہ کے چنگل میں دے دی گئی، جو اگر روح کا فرماں بردار خادم نہ ہو، تو موت سے زیادہ سنگدل اور دوزخ سے زیادہ عذاب آفریں ہوتا ہے۔

مجھے علی پر اعتبار ہے، کیونکہ وہ اخلاق کا اچھا اور دل کا نیک ہے۔ میری بھلائی کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور مجھے خوش رکھنے کے لیے روپیہ پانی کی طرح بہاتا ہے، لیکن یہ تمام چیزیں میرے دل کے لیے اتنا اثر نہیں رکھتیں جتنا حقیقی اور مقدس محبت کا ایک لمحہ!

پیاری سہیلی! میرا مذاق نہ اڑا! کہ میں اب عورت کے دل کی ضرورتوں کو، اور لوگوں سے زیادہ سمجھتی ہوں ـــــ

عورت کا دل ـــ یہ دھڑکتا ہوا دل ـــ یہ محبت کی فضا میں اڑنے والا پرندہ! ـــ یہ زمانہ کی شراب سے لبالب پیالہ! جو روح کے ہونٹوں

کے لیے لبریز کیا گیا ہے ـــــ یہ کتاب جس میں کامیابی و ناکامی، لذت والم اور مسرت وغم کے ابواب ہیں۔ اس کتاب کو کوئی نہیں پڑھ سکتا سوائے اس حقیقی دوست کے، جو عورت کا نصف بہتر ہے اور ازل تا ابد صرف اسی کے لیے پیدا کیا گیا ہے.....

ہاں! میں تمام عورتوں سے زیادہ روح کے مقدار اور قلب کے میلانات کو سمجھنے لگی ہوں، جب سے میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ علی کے شاندار گھوڑے نفیس گاڑیاں، لبریز خزانے اور عزت و شرافت اس غریب نوجوان کی ایک نگاہ کی برابری نہیں کر سکتے، جو اس دنیا میں میری وجہ سے آیا اور میں جس کی وجہ سے اس جہان آب و گل میں پا بہ گل ہوئی ـــــ وہ صابر جو بلاؤں کی کثرت اور جدائی کی ذلت برداشت کر رہا ہے ـــــ وہ مظلوم، جو میرے والد کی مرضی کا شکار ہو گیا ـــــ وہ قیدی، جو گناہ بے گناہی میں زندگی کی ظلمتوں کا اسیر ہو گیا.....

پیاری سہیلی! تم میری تشفی کے لیے زحمت نہ کرنا! اس لیے کہ میرے مصائب میں سے بعض مصیبتیں میری تسکین و تسلی کا باعث ہیں مثلاً یہ کہ میں اپنی محبت کی قوت اور اپنے شوق و آرزو کی شرافت کا ادراک رکھتی ہوں۔

اب میں جب کبھی اپنے آنسوؤں کی چلمن سے جھانکتی ہوں، موت کو روز بروز اپنے سے قریب دیکھتی ہوں، جو مجھے اس جگہ لے جانے کے لیے آ

رہی ہے جہاں میری روح کا رفیق میرا انتظار کر رہا ہے، جہاں میں اس سے ملوں گی اور مجھے ایک طویل مقدس ہمکناری حاصل ہوگی۔

مجھ پر ملامت نہ کرو اگر میں باعصمت بیوی کے فرائض برابر انجام دے رہی ہوں، صبر و سکون سے انسانی قوانین کے احکام کی تعمیل کر رہی ہوں۔ میں اپنے دفاع سے علی کی عزت اپنے دل سے اس پر اعتبار اور اپنی روح سے اس کا ادب کرتی ہوں! لیکن یہ میرے لیے ناممکن ہے کہ میں اپنے وجود معنوی کو اس کے سپرد کر دوں، اس لیے کہ اسے تو خدا نے میرے محبوب کو عطا کر دیا تھا اس سے پہلے کہ میں اپنے محبوب سے آشنا ہوتی۔ خدا نے اپنی مخفی حکمت کی بنا پر چاہا کہ میں اس مرد کے ساتھ زندگی گزاروں، جس کے لیے میں پیدا نہیں کی گئی اور مشیت الٰہی کے مطابق، خاموشی سے میں یہ زندگی بسر کرنے لگی۔ لیکن جب ابدیت کے دروازے وا ہوئے تو میں اپنی روح کے نصف جمیل سے جا ملی اور ماضی کی طرف نگاہ کی ـــــ اس کی طرف، جو اس وقت میری نگاہوں کے سامنے ہے ـــــ جس طرح بہار موسم سرما کی طرف نگاہ کرتی ہے۔ میں نے اپنی اس زندگی کو دیکھا، جس طرح پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جانے والا تنگ و دشوار گزار راہوں کو دیکھتا ہے"۔

یہاں پہنچ کر حسینہ نے اپنا قلم روک لیا اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر

زار زار رونے لگی، گویا اس کی عظمت روح نے اپنے مقدس ترین راز کو صفحۂ کاغذ پر منتقل کرنے سے انکار کر کے اسے ان گرم گرم آنسوؤں کے سپرد کر دیا ہے جو بہت جلد خشک ہو کر پھولوں کی خوشبو اور عاشقوں کی آہ کے بطن — لطیف ایتھر میں جذب ہو جاتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر قلم اُٹھایا اور لکھنا شروع کیا۔

"پیاری سہیلی! کیا وہ نوجوان تمہیں یاد ہے؟ کیا تمہیں اس کی نگاہوں سے پھوٹتی ہوئی شعاعیں اور اس کی پیشانی پر چلتے ہوئے غم یاد ہیں؟ کیا تمہیں وہ تبسم یاد ہے۔ جو اس ماں کے آنسوؤں سے مشابہ تھا۔ جس کا اکلوتا بچہ مر گیا ہو؟ کیا تمہیں وہ آواز یاد ہے۔ جو دُور دراز وادی کی صدائے بازگشت سے ملتی جلتی تھی؟ کیا تمہیں یاد ہے۔ جب وہ طویل و پرسکون نگاہوں سے چیزوں پر غور کرتا اور انوکھے لہجہ میں ان پر روشنی ڈالتا تھا۔ اس کے بعد اپنا سر جھکا کر ایک آہ بھرتا تھا۔ گویا ڈرتا ہے، کہیں اس کی گفتگو کے آئینہ میں اس کے پُرعظمت قلب کے بھید منعکس نہ ہو جائیں؟ کیا تمہیں اس کے عقائد و تصورات یاد ہیں؟ کیا تمہیں اس نوجوان کی یہ تمام باتیں یاد ہیں؟ جسے انسان تو انسان سمجھتا ہے، لیکن میرے والد حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ محض اس لیے کہ وہ مادی لالچ سے

بلند اور موروثی شریف زادوں سے زیادہ شریف؟

ہاں مجھے یقین ہے میری بہن! کہ تم سمجھ لوگی، میں اس دُنیا کی ذلتوں کا شکار اور جہالت کی ماری ہوں! تمہیں اپنی اس بہن پہ ضرور رحم آئے گا، جو تمہارے لیے اس ڈراؤنی رات کی خاموشی میں اپنے دل کے اسرار سے پردے اٹھا رہی ہے ہاں تمہیں یقیناً رحم آئے گا کیونکہ محبت نے تمہارے دل کو بھی اپنا مسکن بنایا تھا۔"

صبح ہوگئی۔ اب وہ لڑکی اٹھی اور خود کو فنا کے حوالے کردیا جس کے خواب بہت ممکن ہے، اس کے لیے بیداری کے خوابوں سے زیادہ لطیف ثابت ہوں۔

اندھی قوّت

بہار آئی اور فطرت ہزاروں کی زبان سے گفتگو کر کے دل کو مسرّت عطا کرنے لگی، اور پھولوں کے ہونٹوں سے مسکرا کر روح کو کامرانی بخشی۔ اس کے بعد اسے غصّہ آیا اور اس نے حسین شہر کو برباد کر دیا۔ یہ دیکھ کر انسان اس کے لہجہ کی شیرینی اور تبسّم کی نرمی بھول گیا۔

خوفناک اندھی قوّت نے وہ سب کچھ ایک لمحہ میں مسمار کر دیا جسے اس نے صدیوں میں تعمیر کیا تھا۔

ظالم موت نے اپنے فولادی پنجے گردنوں میں پیوست کر دیئے اور نہایت سنگدلی سے انہیں پیس ڈالا۔

ہلاکت آفریں آگ زندگی اور رزق کو چاٹ کر گئی۔

اندھیری رات نے جمالِ حیات کو راکھ کے ڈھیروں میں چھپا دیا۔

ہولناک عناصر اپنی اپنی جگہ سے اُٹھے اور بکھر کر انسان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے مکانوں کو مٹی کا ڈھیر بنا دیا اور ان چیزوں کو بُرعت

منتشر کر دیا، جو اس نے بڑی محنت سے جمع کی تھیں۔
شدید زلزلوں نے زمین کو حاملہ کیا اور وہ دردِ زہ کی جان لیوا تکلیفوں میں مبتلا ہوئی۔ لیکن اس کے بطن سے خرابی و بدبختی کے سوا اور کچھ پیدا نہ ہوا۔
یہ سب کچھ ہوا، اور تم زدہ روح دُور سے اسے دیکھتی، اس پر غور کرتی اور دردناک ہوتی رہی۔
اندھی قوتوں کے مقابلہ میں انسان کی محدود قدرت پر غور کرتی رہی اور آگ اور ہلاکت سے بھاگنے والے مصیبت زدوں کے ساتھ دردناک ہوتی رہی؛
ابنِ آدم کے دشمنوں پر غور کرتی رہی، جو زمین کے طبقات اور ابھر کے ذرات میں چھپے بیٹھے ہیں۔ اور ماتم کناں ماؤں اور بھوکے بچوں کے ساتھ دردناک ہوتی رہی۔
مادہ کی سنگ دلی اور بیماری زندگی کے ساتھ اس کے حقارت آمیز سلوک پر غور کرتی رہی اور ان لوگوں کے ساتھ دردناک ہوتی رہی، جو کل اطمینان سے اپنے اپنے گھروں میں سوئے تھے، لیکن آج دُور کھڑے گرم و تلخ آنسوؤں اور الم ناک سسکیوں کے ساتھ حسین شہر پر ماتم کر رہے تھے۔
اُمید کی ناامیدی سے، خوشی کے غم سے اور راحت کے عذاب سے بدل جانے کی کیفیت پر غور کرتی رہی اور ان دلوں کے ساتھ دردناک ہوتی

رہی ہو ناامیدی، غم اور عذاب کے جنگل میں پھڑپھڑا رہے تھے۔
روح اسی طرح غور و فکر اور رنج و الم کی حالت میں کھڑی رہی، کبھی تو وہ نوامیس فطرت کے انصاف پر شک کرنے لگتی جنہوں نے قوتوں کو مربوط کرتے وقت بعض قوتوں کو نظرانداز کر دیا اور کبھی اس شک سے ہٹ کر خاموشی سے کانا پھوسی کرنے لگتی:۔

"کائنات کے پیچھے، ایک ابدی حکمت ہے، جو محسوس مصائب و حوادث سے غیر محسوس نتائج کے محاسن پیدا کرتی ہے، چنانچہ آگ، زلزلے اور طوفان، زمین کے جسم میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو بغض، عداوت اور شرانگیزی قلب انسانی میں، پہلے یہ ابھرتے ہیں، پھر بھڑکتے ہیں۔ اس کے بعد فرو ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے ابھرنے بھڑکنے اور فرو ہو جانے سے دیوتا ایک حسین معرفت پیدا کرتے ہیں۔ جیسے انسان اپنے آنسو، خون اور رزق کے بدلے خریدتا ہے۔"

ایک تصور تھا، جس نے مجھے ساکن و جامد کر دیا۔ اس قوم کی خاکست و نکبت میرے کانوں کو آہ کراہ سے لبریز کر رہی تھی۔ اور میری آنکھوں کے سامنے ان تباہیوں کا نقشہ کھینچ رہی تھی۔ جو عہد ماضی میں، شب و روز کے اسٹیج پر نمودار ہوئی تھیں میں نے دیکھا کہ انسان ہر دور میں، زمین کے سینہ پر قلعے محل اور عبادت گاہیں تعمیر کر رہا ہے اور زمین انھیں اپنے دل میں لوٹا رہی ہے۔ میں نے دیکھا

کہ عظمت و جبروت کے پتلے بڑی بڑی مضبوط عمارتیں بنا رہے ہیں۔ سنگتراش چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر مورتیوں کی شکل میں منتقل کر رہے ہیں اور متعدد دروازوں اور دیواروں کو نقش و نگار سے سجا رہے ہیں۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ اسی خشک زمین نے اپنا منہ کھولا اور انتہائی بے دردی کے ساتھ ان سب چیزوں کو نگل گئی، جو فن کار ہاتھوں اور فنکار دماغوں نے بنائی تھیں۔ اس نے اپنی سنگدلی سے تمام مورتیوں کو سماری اپنے غیظ و غضب سے تصویروں کے نقوش کو محو اور اپنی درشتی سے دیواروں اور ستونوں کی عظمت و شان کو مٹی میں دفن کر دیا۔ اور اس طرح اس دور کا حسین منظر نگاہوں کے سامنے آگیا، جو ابنِ آدم کے تیار کیے ہوئے زیورات سے بے نیاز، سرسبز چراگاہوں کی اس پوشاک میں مگن تھا۔ جس پر ریگ کے ذروں کے ستارے اور کنکریوں کے جواہر ٹنکے ہوئے تھے۔

مگر میں نے ان خوفناک آفتوں اور ان ہولناک بلاؤں میں انسان کی الوہیت کو دیو کی مثال کھڑا پایا۔ جو زمین کی حماقت اور عناصر کی غضبناکی کا مذاق اڑا رہی تھی۔ میں نے اسے روشنی کے ستون کی طرح سان فرانسسکو، بمبئی، تاہر، اور بابل ونینوا کے کھنڈروں میں یہ غیر فانی گیت گاتے سنا۔

"زمین وہی چیزیں لیتی ہے۔ جو اس کے سے ہیں۔ لیکن میری قوتوں کی کوئی حد و نہایت نہیں!"

دو موتیں

رات کی خاموشی میں، موت ہوا پہ خداوندی سے، بلند ہیں بے خبر شہر کی جانب اتری اور اس کے سب سے اونچے مینار پر بیٹھ گئی - اپنی ستاروں جیسی روشن آنکھوں سے اس نے مکانوں کی دیواروں میں شگاف ڈال دیے اور دیکھا کہ روحیں خواب کے پروں پہ سوار ہیں اور جسم نیند کی تاثیرات سے مغلوب! -

جب چاند شفق کے پیچھے چھپ گیا اور شہر نے سائے کی نقاب اپنے چہرہ پر ڈال لی، تو موت اٹھی اور آہستہ آہستہ مکانوں کی طرف چلی - ایک رئیس کے عالی شان محل کے پاس پہنچ کر وہ رکی اور اندر داخل ہو گئی - کوئی روک، کوئی آڑ اس کے راستہ میں مزاحم نہ ہو سکی - رئیس کی مسہری کے قریب جا کر وہ اس کے پہلو میں کھڑی ہو گئی اور اس کی پیشانی کو چھوا، وہ نیند سے چونکا اور موت کے سائے کو اپنے سامنے دیکھ کر نفرت و خوف کی آواز میں چلایا : -

"ڈراؤنے خواب! میرے سامنے سے ہٹ جا! دور ہو! اے خیالِ بد!

پہونچے، تو یہاں کیسے آیا؟ اُچکّے! تیرا مطلب کیا ہے؟ نکل! میں اس گھر کا مالک ہوں! بھاگ! ورنہ میں غلاموں اور دربانوں کو بلا کر تیری ہڈی پسلی ایک کرا دوں گا۔"

موت اس سے اور قریب ہوگئی اور کڑک کر کہنے لگی:۔

"میں موت ہوں! ہوش میں آ! اور غور سے دیکھ!!

رئیس نے پوچھا:۔

"اس وقت تیرا ارادہ کیا ہے؟ تو مجھ سے کیا چاہتی ہے؟ تو کس لئے آئی ہے؟ ابھی تو میرے بہت سے کام ادھورے پڑے ہیں! مجھ جیسے طاقتوروں سے تو کیا طلب کرتی ہے؟ کمزوروں کے پاس جا! میرے پاس سے دُور ہو! مجھے اپنے خونخوار پنجے اور سانپوں کی طرح لہراتے بال نہ دکھا!! جا! کہ میں تیرے ہولناک بازوؤں اور بوسیدہ جسم کو دیکھتے دیکھتے اکتا گیا ہوں"

تھوڑی دیر کی اضطراب آفریں خاموشی کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا:

"نہیں! نہیں!! اے مہربان موت! ـــــ میرے کہنے کا کچھ خیال نہ کر! دل جس بات سے روکتا ہے، خوف وہی بات دل میں ڈالتا ہے! ـــ میرے سونے کے ڈھیروں میں سے ایک ڈھیر لے لے، یا میرے غلاموں میں سے چند غلاموں کی روح سلب کرلے! لیکن مجھے میرے حال پر چھوڑ دے!! ـــ

موت! زندگی سے میرا کھاتہ ہے، جو ابھی تک پورا نہیں ہوا ہے، لوگوں پر میرے روپے واجب ہیں، جو ابھی تک وصول نہیں ہوئے ہیں۔ سمندروں میں میرے مال کے جہاز ہیں، جو ابھی تک ساحل پر نہیں لگے ہیں اور زمین کے سینے میں میرا غلّہ ہے جو ابھی تک نہیں اگا ہے! ان چیزوں میں سے جو تیرا جی چاہے لے لے اور مجھے چھوڑ دے۔

میری بہت سی کنیزیں ہیں، جن کا حسن صبح کی طرح روشن اور کیف آفریں ہے، ان میں سے جسے چاہے تو اپنے لیے انتخاب کر لے!

اور سُن! اے موت! میرا ایک اکلوتا بیٹا ہے، جسے میں چاہتا ہوں اور جو میری تمام امیدوں کا مرکز ہے۔ تو اسے بھی مجھ سے چھین لے! لیکن مجھے چھوڑ دے!

"تو یہ ساری چیزیں لے لے اور مجھے چھوڑ دے"!

موت نے مادی زندگی کے غلام کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھا اور اس کی روح سلب کر کے فضا کے حوالے کر دی۔

اب موت کمزور غریبوں کے محلّے میں پہنچی اور ایک چھوٹے سے مکان میں داخل ہوگئی۔ ایک نوجوان اپنی چھلنگا چارپائی پر پڑا تھا۔ نوجوان کے قریب جا کر موت نے اس کے مطمئن چہرہ کو غور سے دیکھا اور اس کی آنکھوں کو مس کیا۔ وہ بیدار ہو گیا۔ موت کو اپنے پہلو میں دیکھ کر وہ گھٹنوں کے بل کھڑا

ہوگیا اور اس کی طرف بازو پھیلا کر شوق و محبت سے بھری ہوئی آواز میں کہنے لگا:۔

"میں حاضر ہوں! اے حسین موت! اومیرے خوابوں کی حقیقت! اے میری امیدوں کی دُنیا! میری روح کو قبول فرما! میرے نفس کی محبوبہ! مجھے چمٹا لے! تو مہربان و رحم دل ہے! مجھے یہاں نہ چھوڑ!۔

تو دیوتاؤں کی فرستادہ ہے، تو حق کا دست راست ہے! مجھ سے پہلو تہی نہ کر ——— میں نے بار ہا تیری آرزو کی، لیکن تو مجھ سے ٹلی! میں نے تجھے بہت پکارا، لیکن تو نے دھیان نہ دیا ——— اب تو نے میری سُن لی ہے خدارا! اب میرے شوق کا جواب سرد مہری سے نہ دے! ——— میری روح سے ہم کنار ہو جا! میری پیاری موت!"

موت نے اپنی نرم و نازک انگلیاں نوجوان کے ہونٹوں پر رکھیں اور اس کی جان نکال کر اپنے بازوؤں کے نیچے رکھ لی۔

فضا میں معلق ہو کر عورت نے اس دُنیا کی طرف دیکھا اور فضا میں اپنے ان الفاظ کی گونج چھوڑ گئی:

"ابدیت کی طرف وہی لوٹے گا، جو ابدیت سے آیا ہے!"

زمانہ کے اسٹیج پر

وہ ایک لمحہ، جو حسن کی تابشوں اور محبت کے خوابوں کے درمیان گردش کرتا ہے، اس ایک صدی سے زیادہ بلند اور زیادہ قیمتی ہے جو حریص دولت مند کے حضور بھوکے نیفر کی پیش کی ہوئی عظمت سے لبریز ہو!

اس لمحہ سے انسان کی الوہیت وجود پذیر ہوتی ہے اور اس صدی میں خواب ہائے پریشان کی چادر اوڑھ کر گہری نیند سو جاتی ہے!

اس لمحہ میں نفس، انسان کے بنائے ہوئے مختلف قوانین کے جور سے آزاد ہوتا ہے اور اس صدی میں جور و ظلم کی زنجیروں سے گراں بار، نسیان و فراموشی کی چار دیواری میں محبوس ہو جاتا ہے۔

وہ لمحہ نغمۂ سلیمانی کا ہنگورہ، مسیحؑ کا وعظ اور فارض کا پیغام ہے اور وہ صدی، اندھی قوت ہے۔ جس نے بعلبک کے ہیکل ڈھا دیئے، تدمر کی عمارتیں مسمار کر دیں اور بابل کے محلوں کو خاک کا ڈھیر بنا دیا۔

اور وہ ایک دن جسے روح نے فقیر کے اتلافِ حقوق پر افسوس

اور عدل و انصاف کے نقدان پر ماتم کرتے ہوئے گزارا ہے، اس عمر سے اعظم و افضل ہے، جو انسان انانیت کے احکام کی تعمیل میں اور خواہشوں کے دسترخوان پر خوش خوش بسر کرتا ہے۔

وہ دن، دل کو اپنی آگ سے پاک اور اپنے نور سے لبریز کرتا ہے اور وہ عمر اس پر اپنے سیاہ پردوں کا سایہ ڈال کر اسے زمین کی تہوں میں گاڑ دیتی ہے۔

وہ دن یوم عید ہے، یوم جلجلہ ہے، یوم ہجرت ہے اور وہ عمر، وہ عمر ہے، جو نیرو نے ظلم و ستم کے بازاروں میں ضائع کی۔ قارون نے حرص و طمع کی قربان گاہ پر گنوائی اور جان ڈان نے جسمانی اغراض کی قبر میں دفن کر دی۔

یہی ہے وہ زندگی —— جسے راتیں ٹریجیڈی کی طرح زمانہ کے اسٹیج پر کھیلتی ہیں، دن گیتوں کی طرح گاتے ہیں اور بالآخر ابدیت جوہر کی طرح محفوظ کر لیتی ہے۔

میرے دوست

میرے مفلس دوست! اگر تو جانتا کہ یہی مصیبت، جو تجھ پر زندگی بھر کے لیے مسلط کر دی گئی ہے، تیرے لیے عدل و انصاف کے عرفان اور رازِ حیات کے ادراک کا سبب ہے، تو مجھے یقین ہے کہ تو خداوندی تقسیم پر مطمئن ہو جاتا۔ میں نے "عدل و انصاف کا عرفان" کہا ہے، اس لیے کہ سرمایہ دار اپنے خزانوں کی دھن میں اس عرفان سے بے خبر ہے۔ میں نے "رازِ حیات" کہا ہے، اس لیے کہ طاقت و عظمت و بندگی کے پیچھے اس ادراک کی طرف سے غافل ہے۔ اب تو انصاف سے فرحت اندوز ہو کہ تو اس کی زبان ہے اور زندگی سے مسرت حاصل کر کہ تو اس کی کتاب ہے۔ خوش ہو جا! کہ تو اپنے معاونوں کی فضیلت کا سرچشمہ ہے اور دوسروں کی فضیلت تیرے دستِ تعاون کی محتاج!

میرے غم زدہ دوست! اگر تو جانتا کہ یہی ذلت جس سے تو مغلوب ہو گیا ہے، وہ قوت ہے جو دل کو روشن کرتی ہے اور روح کو طنز و استہزا

کی پستیوں سے نکال کر اعتبار کے بلند درجوں پر پہنچاتی ہے، تو یقیناً تو اس ذلّت کی میراث پر قناعت کر لیتا اور اس کے اثرات سے تہذیبِ شائستگی حاصل کرتا تو جان لیتا کہ زندگی ایک زنجیر ہے، جس کی کڑیاں آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ وہاں تجھے معلوم ہو جاتا کہ غم ایک سنہری کڑی ہے، جو موجودہ حالات کی اطاعت اور مستقبل کی خوشی کے دل بہلاووں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے، جس طرح صبح نیند۔ اور بیداری کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے

میرے دوست! غریبی شرافتِ نفس کا اظہار کرتی ہے اور امیری خباثتِ نفس کا۔ غم جذبات میں لطافت پیدا کرتا ہے اور سرور انہیں فاسد کر دیتا ہے، اس لیے کہ انسان دولت و سرور میں اضافہ کے لیے انہیں ہمیشہ غلام بنائے رکھتا ہے۔

اگر غریبی اور غم مٹ جائیں تو نفس اس صفحہ کی مانند ہو جائے۔ جس پر انانیت اور زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی محبت کے سوا کچھ نہ لکھا ہو، اور جس کے الفاظ صرف مادّی خواہشوں پر دلالت کرتے ہوں، اس لیے کہ میں نے دیکھا اور الوہیت ——— انسان کی ذاتِ معنوی ——— کو ایک ایسی چیز پایا، جو نہ دولت کے ذریعہ خریدی جا سکتی ہے، نہ عصرِ حاضر کے نوجوانوں سے نمو پا سکتی ہے۔ میں نے غور کیا تو دیکھا کہ

سرمایہ اپنی الوہیت سے غافل، مال و زر کی طمع میں گرفتار ہے، اور وہ دور حاضر کا نوجوان اسے دھتکار کر لذتوں کے پیچھے پیچھے دوڑا چلا جا رہا ہے

وہ ایک ساعت، جو اے غریب کسان! تو کھیت سے واپس آنے کے بعد اپنے بیوی بچوں میں گزارتا ہے، مستقبل کی معاشرتی زندگی کی طرف اشارہ ہے —— وہ آنے والی نسلوں سعادت و کامرانی کا عنوان ہے!

اور وہ زندگی، جو سرمایہ دار اپنے خزانوں میں بسر کرتا ہے، کمینہ پن کی زندگی ہے، جو قبروں میں کیڑوں کی زندگی سے مشابہ ہے وہ خوف و دہشت کی طرف کنایہ ہے!

اور وہ آنسو، جو اے غم زدہ! تیری آنکھوں سے بہتے ہیں فراموش کار کی ہنسی اور مذاق اڑانے والے کے قہقہہ سے زیادہ شیریں ہیں۔ یہ آنسو دل کو بغض کے میل کچیل سے پاک کرتے ہیں اور رونے والے کو بتاتے ہیں کہ اسے اپنے احساسات کے ذریعہ کس طرح ٹوٹے ہوئے دلوں کا شریک ہونا چاہیئے؟ ——۔ یہ آنسو، مسیح ناصری کے آنسو ہیں؟

اور وہ قوت، جو اے فقر و احتیاج کے مارے! تو کھیت میں لٹاتا ہے اور جس کا پھل طاقت ور سرمایہ دار حاصل کرتا ہے۔ تیری طرف لوٹے گی،

اسس یہ ہے کہ اشیاء منشائے فطرت کے مطابق، اپنے مرکز کی طرف
لوٹتی ہیں۔
اور وہ مایوسی، جو اسے حزن و ملال کے پتلے! تجھ پر چھائی ہوئی
ہے بحکمِ الٰہی، امید و فرحت سے بدل جائے گی۔
آنے والی نسلیں، غریبی سے مساوات اور رنج و غم سے محبت
کا سبق حاصل کریں گی!

محبّت کی کہانی

ایک نوجوان، جس نے ابھی صبحِ زندگی میں قدم رکھا تھا۔ اپنے تنہا مکان میں بیٹھا کبھی کھڑکی میں سے تاروں بھرے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ اور کبھی نوخیز حسینہ کی تصویر کو، جو اس کے ہاتھ میں تھی — تصویر، جس کے خطوط اور رنگ اس کے چہرہ پر منعکس ہو کر، اس عالم کے اسرار اور ابدیت کے رموز کے انکشاف کا سبب بن رہے تھے — ایک عورت کے خد و خال کے نقوش، جو اس کی آنکھوں کو کان بنا کر، ان سے سرگوشیاں کر رہے تھے — ایسے کان بنا کر، جو اس کمرہ کی فضا میں منڈلاتی ہوئی روحوں کی زبان سمجھتے تھے — اور اپنے مجموعی اثر سے ایسے دل وجود میں لا رہے تھے، جو محبت سے روشن تھے اور شوق سے لبریز!

ایک گھنٹہ اس طرح گزر گیا، گویا وہ دلکش خوابوں کا ایک لمحہ ہے۔ یا بقا کی زندگی کا ایک سال۔ نوجوان نے وہ تصویر اپنے سامنے رکھی اور کاغذ و قلم لے کر لکھنا شروع کیا۔

"میری روح کی محبوبہ"

وہ بڑی بڑی خفیفتیں، جو ماورائے فطرت ہیں، عام انسانی کلام کے ذریعہ ایک انسان سے دوسرے انسان کی طرف منتقل نہیں ہوتیں، بلکہ وہ دو روحوں کے درمیان خاموشی کو اپنے لیے راستہ بنا لیتی ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس رات کی خاموشی ہم دونوں کے درمیان گرم رفتار ہے، اس کے ہاتھ میں وہ خطوط ہیں، جو سطحِ آب پر موجِ نسیم کی لکھی ہوئی تحریروں سے زیادہ نرم و نازک ہیں اور وہ ہمارے دلوں کے مکتوب ہمارے دلوں کو پڑھ کر سُنا رہی ہے۔

لیکن جس طرح خدا نے چاہا اور روح کو جسم کے قید خانہ میں مقید کر دیا، اسی طرح محبت نے چاہا اور مجھے کلام کا اسیر کر دیا۔

میری محبوبہ! لوگ کہتے ہیں کہ محبت اپنے حلقہ بگوش کے لیے ہلاکت آفریں آگ بن جاتی ہے، لیکن میں کیا دیکھتا ہوں کہ فراق کی گھڑیاں ہماری ذاتِ معنوی کو جُدا کرنے پر قادر نہ ہو سکیں۔ جس طرح پہلی ملاقات کے وقت مجھے ایسا معلوم ہُوا تھا کہ میری روح تجھے ہمیشہ سے جانتی ہے اور تیرے چہرے پر میری نظر اور حقیقت پہلی نظر نہیں ہے۔

میرے دل کی ملکہ! وہ ساعت جس نے ہمارے دلوں کو عالمِ علوی سے نکال کر دلوں کو ایک جگہ جمع کیا، ان چند ساعتوں میں سے ایک

ساعت ہے، جس نے نفس کے ازلی اور ابدی ہونے پہ میرے اعتقاد کو پختہ کیا۔ اس قسم کی ساعت میں فطرت اپنے انتہائی عدل کے چہرہ سے نقاب اٹھاتی ہے، جسے عام طور پہ ظلم سمجھا جاتا ہے!

میری پیاری! تجھے وہ باغ یاد ہے؟ جہاں کھڑے ہو کر ہم اپنے اپنے محبوب کا چہرہ دیکھتے تھے؟ تجھے معلوم ہے! تیری نگاہیں مجھے کہتی تھیں کہ تجھے جو محبت مجھ سے ہے وہ مجھ پہ تیری مہربانی کا نتیجہ نہیں ہے، وہ نگاہیں جنہوں نے مجھے بتایا کہ میں خود سے اور دُنیا والوں سے کہوں "وہ عطا جس کا سرچشمہ عدل و مساوات ہو، اس بخشش سے کہیں بہتر ہے جس کا نقطۂ آغاز مہربانی اور کرم ہو۔ اور وہ محبت، جو خال و خال کے حسن و دلکشی پہ مبنی ہو، جوہڑوں کے گندے پانی سے مشابہت رکھتی ہے!"

میری جان! میرے سامنے جو زندگی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اُسے عظمت و جمال کا مرقع دیکھوں۔ وہ ایک ایسی زندگی ہو، جو آنے والے انسان کے تصوّر سے پیمانِ اخوّت باندھے اور اس کے اعتبار و محبّت کی طالب ہو۔ ہاں! میں وہ زندگی چاہتا ہوں، جس کا آغاز اس وقت ہُوا تھا۔ جب میں تجھے پہلی مرتبہ ملا تھا اور جس کے غیر فانی ہونے کا مجھے کامل یقین ہے کہ تیرے وجود کے متعلق میرا یہ ایمان ہے کہ وہ میری اس قوت کو، جو اللہ نے مجھ میں ودیعت کی ہے۔ بہترین بار شان

-------- اقوال واعمال کی صورت میں نمایاں کر سکتا ہے جس طرح سورج باغ کے خوشبودار پھولوں کو زمین سے نمودار کرتا ہے۔

اپنی ذات اور قوموں سے میری یہ محبت یونہی رہے گی۔ وہ اپنی ہمہ گیری کے لیے اسی انانیت سے پاک اور تجھے خصوصیت کی بنا پر اسی ابتذال سے بلند رہے گی۔

نوجوان اٹھا اور آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے بعد اس نے کھڑکی میں دیکھا کہ چاند افق کے پیچھے سے طلوع ہو رہا ہے اور فضا اس کی لطیف شعاعوں سے روشن ہے وہ لوٹا اور اپنے خط میں یہ سطریں بڑھا دیں۔

"میری پیاری! اب مجھے معاف کر! کہ میں نے غیر کی طرح تجھے مخاطب کیا ہے حالانکہ تو میرا وہ نصف جمیل ہے، جسے میں نے اس وقت کھو دیا تھا۔ جب ہم دونوں ایک ہی وقت میں دستِ خداوندی سے نکلے تھے —— مجھے معاف کر! میری محبوبہ!"

بے زبان جانور

بے زبان جانور کی نگاہوں میں ایک کلام ہے جسے
حکیم سمجھتا ہے۔ (ہندی شاعر)

....

ایک دن، شام کو، جبکہ میرے تصورات میری عقل پر غالب آ گئے تھے میں گھر سے نکلا اور شہر کے محلوں میں سے ہو کر گزرنے لگا۔ ایک خالی مکان کے سامنے پہنچ کر میں رُک گیا۔ جس کی دیواریں ڈھ گئی تھیں اور ستون زمین پر آ رہے تھے۔ مکان کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مدتوں سے غیر آباد ہے اور اس پر کوئی نہ کوئی غم انگیز تباہی نازل ہوئی ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک کتا راکھ پر پڑا ہے۔ کمزور جسم زخموں سے چور چور ہے اور بیماریوں نے اسے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیا ہے۔ اس کی نگاہیں مغرب میں غروب ہوتے ہوئے سورج پر جمی ہیں، اس کی آنکھوں کو ذلت کی پرچھائیوں نے تاریک کر دیا ہے اور یاس و ناامیدی ان سے ٹپکی پڑتی ہے۔ گویا جانتا ہے کہ سورج نے اس ویران مقام سے جو کمزور جانوروں کو

ستانے والے لڑکوں کی دسترس سے دُور ہے، اپنے نفاس کی حرارت واپس لینی شروع کر دی ہے اور اسی لیے وہ اسے افسوسناک الوداعی نگاہوں سے تک رہا ہے۔ میں آہستہ آہستہ اس کی طرف چلا، اپنے دل میں خواہش لیے ہوئے کہ اگر میں اس کی زبان میں گفتگو کر سکتا تو ان تکلیفوں پر اسے دلاسا دیتا اور اس مصیبت پر اس سے ہمدردی ظاہر کرتا۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے مجھ سے خوف زدہ ہو کر اپنی قریب الختم زندگی کی باقی ماندہ قوتوں کو جمع کیا اور کوشش کی کہ اپنی ان ٹانگوں کے سہارے وہاں سے چلا جائے جنہیں بیماری نے مفلوج کر دیا تھا اور موت جن کی حفاظت کر رہی تھی۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے اٹھ بھی نہ سکا اور مجھے تکنے لگا ایک ایسی نگاہ سے جس میں استرحام کی تلخی اور کرم طلبی کی شیرینی تھی —— ایک ایسی نگاہ سے جس میں جھکاؤ کے ساتھ ملامت بھی تھی —— ایک ایسی نگاہ سے جو نطق کی قائم مقام تھی، اس لیے انسان کی زبان سے زیادہ فصیح اور عورت کے آنسوؤں سے زیادہ بلیغ تھی۔

جب میری نگاہیں اس کی غمگین نگاہوں سے ملیں تو میرے جذبات میں حرکت پیدا ہوئی اور احساسات بیدار ہو گئے۔ میں نے ان نگاہوں کو مجسم کیا اور انسانی کلام کا جامہ پہنا دیا۔ وہ نگاہیں کہہ رہی تھیں۔

"مجھ پر جو کچھ بیت رہی ہے وہی میرے لیے کافی ہے! میں نے انسان کے جتنے مظالم برداشت کئے ہیں اور بیماریوں کی جتنی تکلیفیں جھیلی ہیں، وہی

میرے لیے بہت ہیں!! جاؤ مجھ بیار دیرے سکون پر رحم کرو، مجھے سورج کی حرارت
سے زندگی کے کچھ مجھے حاصل کرنے دو!! میں ابنِ آدمؑ کے ظلم اور سنگ دلی سے
بھاگ کر اس راکھ کے ڈھیر پر آ پڑا ہوں، جو اس کے دل سے زیادہ نرم ہے،
اس ویرانے میں آ چھپا ہوں جو وحشت ناکی میں اس سے کہیں کم ہے میرے پاس
سے چلے جاؤ! کہ تم بھی زمین کے انہیں رہنے بسنے والوں میں سے ہو، جن کے
فیصلے ادھورے اور انصاف سے عاری ہوتے ہیں۔

میں ایک حقیر جانور ہوں، لیکن میں نے انسان کی خدمت کی ہے، اس
کے گھر میں ایک مخلص و وفادار کی طرح رہا ہوں، اس کی رفاقت میں میں نے
حفاظت اور جاسوسی کے فرائض انجام دیے ہیں۔ میں اس کے غم اور خوشی میں
برابر کا شریک رہا۔ اس کی غیر موجودگی میں اسے یاد کرتا اور اس کی آمد پر خوشی سے
پھولا نہ سماتا۔ میں نے اس کے دسترخوان کے بچے ہوؤں پر قناعت کی اور اس کی نچوڑی
ہوئی ہڈیوں کو اپنے لیے نعمت سمجھا —— لیکن جب میں بوڑھا ہو گیا، بیماریوں
نے میرے جسم میں اپنے پنجے گاڑ دیے تو اس نے مجھے نکال باہر کیا اور گلی کوچوں
کے بے رحم لڑکوں کا کھلونا، بیماریوں کے لیے تیروں کا نشانہ اور ہر قسم کی غلاظت کا مرکز
بنا دیا۔

اے آدمؑ کے بیٹے! میں ایک کمزور جانور ہوں، لیکن مجھ میں اور تیرے ان بہت

سے کمزور بھائیوں میں ایک نسبت ہے، جن کی قوتیں جواب دے جاتی ہیں تو روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو محتاج ہو جاتے ہیں اور تباہ حالی کے گڑھے میں گر پڑتے ہیں۔

میں ان سپاہیوں کی مثال ہوں، جو اپنی جوانی میں اپنے وطن کی طرف سے لڑتے ہیں اور ادھیڑ عمر میں کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ لیکن جب زندگی کا سرمائی موسم شروع ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ پاؤں بے کار ہو جاتے ہیں تو اسے دھکے دیے جاتے ہیں۔ اسے بھلا دیا جاتا ہے!

میں اس عورت کی طرح ہوں۔ جو اپنی جوانی کو جوان دل کی تفریح کے لیے بناتی سنوارتی ہے۔ بیوی بن کر بچوں کو پالنے کے لیے رات رات بھر جاگتی ہے۔ پختہ عمر کی عورت ہو کر مردانِ مستقبل تیار کرنے کے لیے مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھاتی ہے لیکن جب بوڑھی ہو جاتی ہے تو مکروہ چیز سمجھ کر بالکل فراموش کر دی جاتی ہے — آہ! اے انسان! تو کتنا ظالم ہے اور کس قدر سنگ دل!!"

اس جانور — کتے — کی نگاہیں کلام کر رہی تھیں اور میرا دل سمجھ رہا تھا۔ میرے ذہن کا یہ عالم تھا کہ کبھی تو اس بے زبان جانور پر ترس کھاتا تھا اور کبھی اپنے ابنائے جنس کے ہولناک قصور سے لرز اٹھتا تھا۔

جب اس کتے نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تو میں نے اسے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے چلا آیا۔

صلح

شاخوں اور پودوں کو دوہرا کر دینے کے بعد طوفان فرو ہُوا۔ اور ستارے اس طرح نمودار ہو گئے۔ گویا سطحِ آسمان پہ ٹوٹی ہوئی بجلی کے ٹکڑے ہیں۔ کھیتوں پہ ایسا سکون طاری ہو گیا، جیسے عناصر میں کبھی جنگ ہی نہ ہوئی تھی۔

اس وقت ایک دوشیزہ اپنی خواب گاہ میں داخل ہوئی اور پلنگ پہ اوندھے منہ گر کر زار و زار رونے لگی۔ اس کی چیخیں بلند سے بلند تر ہو گئیں اور آتش ناک سانسوں نے ان الفاظ کی شکل اختیار کر لی۔

"یا رب! اسے میرے پاس واپس بھیج دے کہ میرے آنسو خشک ہو گئے ہیں اور دل سینہ میں پگھل گیا ہے۔ اے وہ رُوح! جس کے فیصلے انسان کی دانشمندی سے کہیں بہتر حکمت پہ مبنی ہوتے ہیں۔ اسے میرے پہلو میں پہنچا دے۔ کہ صبر و ضبط نے مجھے ادھ موا کر دیا ہے اور مایوسی مجھ پہ بُری طرح چھا گئی ہے۔ بار الہا! اسے جنگ کے فولادی چنگل سے نجات دلا! —— اسے ظالم موت سے بچا! اور ایک کمزور نوجوان سمجھ کر اس پر رحم کر، جسے طاقت ور کی قوت نے اس گناہ پہ مجبور

کیا ہے، میرے مولیٰ! اسے میری خاطر بچا لے!! — اے محبت! اپنی حریف۔ جنگ پر غالب آ اور میرے محبوب کو اس کے پنجہ سے چھڑا! کہ وہ تیرے حلقہ بگوشوں میں ہے — اے موت! اس کے پاس سے ہٹ جا اور اسے میرے پاس آنے دے یا پھر آ۔ اور مجھے اس کے پاس لے جا!"

اس نے ابھی اپنا آخری فقرہ ختم ہی کیا تھا کہ ایک نوجوان سر پر سفید پٹیاں باندھے داخل ہوا جن پر قرمزی حروف میں "جنگ" لکھا ہوا تھا۔ وہ دوشیزہ کے قریب آیا۔ آنسو اور مسکراہٹ کے ساتھ اسے سلام کیا، اس کے بعد اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں پر رکھ لیا۔ ایک ایسی آواز میں جس سے محبت کی تاثیریں اور ملاقات کی فرحت بخشیاں نمایاں تھیں، اس نے کہا:۔

"ڈرو نہیں! جس کے لیے تم رو رہی تھیں، وہ تمہارے پاس آگیا ہے!۔ خوش ہو جاؤ! کہ جو چیز جنگ نے چرائی تھی صلح نے وہ واپس کر دی ہے اور جس شخص کو خواہشوں کے بندے نے تم سے چھینا تھا۔ انسانیت کے نوجوان نے اسے تمہارے پاس بھیج دیا ہے۔

میری پیاری آنسو پونچھو اور مسکراؤ! کہ سنگدلی جب کسی قوم کے پیشواؤں کو اندھا کر دیتی ہے تو قدرت کی طرف سے اس قوم کو مہربان پیشوا مل جاتے ہیں۔ میرے زندہ واپس آنے پر تعجب نہ کرو! کہ محبت کی ایک نشانی ہے جسے

دیکھ کہ موت واپس چلی جاتی ہے اور دشمن جب اس سے دوچار ہوتا ہے تو شکست کھا جاتا ہے

میں وہی ہوں! مجھ پر سائے کا گمان نہ کرنا، جو موت کے میدان سے اس چار دیواری میں آیا ہے، جہاں تمہارا حسن اور اطمینان جلوہ فرما ہے۔

مجھ سے خوف نہ کھاؤ! میں وہ حقیقت ہوں، جو آگ تیزدل سے اس لیے بچ نکلی ہے کہ لوگوں کو جنگ کے مقابلہ میں محبت کی فتح کی خبر سنائے۔ میں وہ کلمہ ہوں جو "مردِ صلح" کی زبان سے ادا ہوا ہے، اس لیے کہ زندگی داستانِ سعادت کا عنوان بنے!"

نوجوان کی زبان رک گئی اور گفتگو کی جگہ آنسوؤں نے لے لی، عشرتِ سرور کے فرشتے اس چھوٹے سے مکان کے گرد منڈلانے لگے اور دو دلوں نے وہ راحت و سکون پالیا۔ جو ایک دوسرے سے جدا ہوتے وقت کھو دیا تھا۔

صبح ہونے پر وہ دونوں کھیت میں گئے اور فطرت کے حسن کا نظارہ کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد، جس میں بہت سی داستانیں روپوش تھیں، سپاہی نے دور مشرق کی طرف دیکھا اور اپنی محبوبہ سے کہا:۔

"دیکھو! سورج تاریکی سے طلوع ہو رہا ہے!"

شاعر

ایک کڑی، جو اس عالم کو آنے والے عالم سے ملاتی ہے!
ایک شیریں چشمہ، جس سے پیاسی روحیں پانی پیتی ہیں!
دریائے حسن کے کنارے ایک درخت، جس کے پکے ہوئے پھل بھوکے دلوں کی غذا ہیں!
کلام کی شاخوں پہ چہکنے والا بلبل، جس کے نغمے جسم کی خلاؤں کو رقت نہ لطافت سے پر کر دیتے ہیں!
ایک سفید بادل، جو خط شفق پہ نمودار ہو کر پھیلتا ہے، بلند ہوتا ہے اور آسمان پر چھا جاتا ہے پھر برستا ہے تاکہ چمن حیات کے پھولوں کو سیراب کرے!
ایک فرشتہ جسے دیوتاؤں نے انسان کو الٰہیات کی تعلیم دینے کے لیے بھیجا ہے۔
ایک پھیلی ہوئی روشنی جسے نہ تاریکی چھپا سکتی ہے، نہ اس پر غالب آسکتی ہے!
ایک چراغ، جسے محبت کی دیوی — عشترت نے تیل سے بھر!

اور موسیقی کے دیوتا ——— اپالو نے روشن کیا۔

ایک تنہا انسان، جس کا لباس سادگی اور تمنا و لطافت ہے۔ جو شجرِ حیات کے سائے میں بیٹھ کر ایجاد و اختراع کا سبق پڑھتا اور رات کی خاموشی میں جاگ کر نزولِ روح کا انتظار کرتا ہے۔

ایک کسان، جو احساسات کے مرغزار میں اپنے دل کے بیج بوتا ہے۔ جو اس سرسبز کھیتی کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں، جسے انسانیت اپنی غذا بناتی ہے۔ یہی ہے وہ شاعر جسے لوگ زندگی میں کوڑی کو نہیں پوچھتے اور اس کی قدر و قیمت اس وقت پہچانتے ہیں جب وہ اس دنیا کو خیرباد کہہ کر اپنے سماوی وطن کی راہ لیتا ہے۔ یہی ہے وہ جو انسان سے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے سوا کچھ نہیں چاہتا ...... یہی ہے وہ جس کے انفاس بلند ہوتے ہیں اور فضا کو زندہ اور حسین پرچھائیوں سے لبریز کر دیتے ہیں، لیکن انسان اسے کھانے کے لیے روٹی کے چند ٹکڑے اور رہنے کے لیے چند گز زمین دینے میں بھی بخل سے کام لیتا ہے۔

اے انسان! کب تک؟ ——— اے کارگاہِ وجود! کب تک تو ان لوگوں کے لیے فخر و مسرت سے مکان بناتی رہے گی۔ جو زمین کو خون کے چھینٹوں سے رنگین کرتے ہیں؟ اور کب تک بے پروائی سے ان لوگوں کو نظرانداز کرتی رہے گی۔ جو ذاتی خوبیوں سے تجھے امن و سلامتی کا تحفہ دیتے ہیں؟ تو کب تک

تاناؤں اندرا ان لوگوں کی تعظیم کرتی رہے گی جو اپنی گردنوں پر غلامی کا جُوا رکھ لیتے ہیں اور کب تک ان ہستیوں کو فراموش کرتی رہے گی، جو رات کی تاریکی میں اپنی آنکھوں کا نور برساتی ہیں تاکہ تجھے دن کی روشنی کا نظارہ کرنا سکھائیں اور ساری عمر بدبختی کے چنگل میں پھنسی رہتی ہیں اس خیال سے کہ کہیں تو خوش بختی کی لذّت کو نہ گنوا بیٹھے!

اور تم، اے شاعرو! —— اس زندگی کو زندگی کا روپ دینے والو! تم قوموں کی سنگ دلی سے تنگ آکر قوموں پر غالب آگئے ہو اور غور کے کانٹوں سے غضب ناک ہو کر تم نے غار[1] کے تابوتوں کو تتر بتر کر دیا ہے!

اے شاعرو! تم نے دلوں پر قبضہ جما لیا ہے اور تمہارے قبضہ کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔

---

[1] ایک بہت گھن دار درخت، جو جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ (مترجم)

میرا یومِ ولادت

۶ر دسمبر ۱۹۰۸ء کو پیرس میں لکھا گیا

....

آج کے دن میں اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوا!

آج کے دن پچیس برس پہلے، خاموشی نے مجھے اس چیخ پکار اور لڑائی جھگڑے سے بھری ہوئی ہستی کے ہاتھوں میں سونپا!

میں نے پچیس مرتبہ سورج کے گرد چکر لگایا۔ اور مجھے معلوم نہیں کہ چاند نے میرے گرد کتنی مرتبہ گردش کی لیکن میں اب تک روشنی کے اسرار سمجھ سکا۔ نہ تاریکی کے بھید معلوم کر سکا۔

میں نے زمین، چاند، سورج اور ستاروں کے ساتھ پچیس مرتبہ اس بلند اور اعلیٰ ناموس کا طواف کیا لیکن دیکھو! اس وقت بھی میری روح اس ناموس کے مختلف نام اس طرح چپکے چپکے دُہرا رہی ہے، جس طرح غار سمندر کی موجوں کی آواز دُہراتے ہیں۔ وہ اس کے وجود سے قائم ہے، لیکن اس کی ماہیت

کو نہیں جانتی، اس کے مدّو جزر کے نغمے الاپتی ہے، لیکن اس کے ادراک سے عاجز ہے۔

پچیس برس پہلے، زمانہ کے ہاتھ نے اس ہولناک اور عجیب و غریب عالم کی کتاب میں مجھے ایک کلمہ کے طور پر لکھا۔ چنانچہ میں ایک مبہم کلمہ ہوں، جس کے معنی مشتبہ ہیں، جو کبھی لاشئے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کبھی بے شمار اشیاء کی طرف!

ہر سال آج کے دن، میری روح پر مختلف قسم کے افکار و تصورات ہجوم کرتے ہیں، بیتے ہوئے دنوں کے جلوس کو میرے سامنے ٹھہراتے ہیں، گذری ہوئی راتوں کی پرچھائیاں مجھے دکھاتے ہیں۔ اور پھر انہیں منتشر کر دیتے ہیں جس طرح ہوائیں، خطِ شفق پر بادلوں کے بچے کھچے ٹکڑوں کو منتشر کر دیتی ہیں اور یہ تمام چیزیں میرے کمرے کے گوشوں میں فنا ہو جاتی ہیں، جس طرح نہروں کے نغمے سنسان اور دُور دراز وادیوں میں کھو جاتے ہیں۔

ہر سال، آج کے دن وہ روحیں، جنہوں نے میری روح کا نقشہ کھینچا ہے دُنیا کی ہر سمت سے میری طرف دوڑی دوڑی آتی ہیں اور ایک غم آگیں یاد کے راگ گاتی ہوئی مجھے گھیر لیتی ہیں، اس کے بعد آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی ہیں اور محسوسات کے پردے میں چھپ جاتی ہیں، گویا پرندوں کا ایک غول ہے، جو

کسی ناکارہ کھلیان پر اُترتا ہے، لیکن چگنے کے لئے کوئی دانہ نہ پاکر اپنے بازو پھڑپھڑاتا ہے اور کسی دوسرے مقام کی طرف اُڑ جاتا ہے۔

آج کے دن، میری حیاتِ ماضی کے نقوش و معانی میرے سامنے اس طرح آکھڑے ہوتے ہیں۔ گویا ایک چھوٹا سا آئینہ ہیں، میں یہ آئینہ دیر تک دیکھتا رہتا ہوں۔ لیکن مجھے اس میں موت کے چہروں تک سیاہ شب و روز کے چہرے نظر آتے ہیں یا بڈھوں کے جھرّیاں پڑے ہوئے خد و خال کی طرح اُمید امید وں، خوابوں اور آرزوؤں کے خد و خال۔ اس کے بعد میں اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہوں اور دوبارہ اس آئینہ میں دیکھتا ہوں۔ اب مجھے اپنے چہرہ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ میں اپنے چہرہ پر نگاہیں جما دیتا ہوں۔ اور اس میں غم کے سوا مجھے کوئی چیز نہیں دکھائی دیتی۔ پھر میں غم سے بات کرنی چاہتا ہوں لیکن اُسے گونگا پاتا ہوں، جو بات نہیں کرسکتا۔

اگر غم بات کرسکتا تو اس کی بات خوشی کی بات سے زیادہ شیریں ہوتی!

گزشتہ پچیس برس میں میں نے بہت سے لوگوں سے محبت کی، ان بہت سی چیزوں کو چاہا، جس سے دُنیا نفرت کرتی ہے اور ان بہت سی چیزوں سے نفرت کی جنہیں دنیا چاہتی ہے۔ لیکن وہ ہستی جسے میں بچپن میں چاہتا تھا۔ اسی کو آج بھی چاہتا ہوں، اور جسے آج چاہتا ہوں، اسی کو زندگی بھر چاہتا رہوں گا

کیونکہ محبت ہی میری تمام خواہشوں کا مرکز ہے اور اسے کوئی مجھ سے نہیں چھین سکتا۔

میں نے اکثر موت سے محبت کی ہے۔ چنانچہ اسے پیارے پیارے ناموں سے پکارا ہے، چوری چھپے اور کھلے بندوں اس کی تعریف میں قصیدے پڑھے ہیں اور باوجودیکہ میں نے موت سے عہد شکنی نہیں کی، اس کی محبت کو اپنے دل سے نہیں نکالا، لیکن اسی کی طرح زندگی کو بھی چاہنے لگا ہوں، کیونکہ موت اور زندگی میرے نزدیک حسن میں ایک دوسرے کی شریک اور میری محبت و الفت میں برابر کی حصہ دار ہیں۔

میں نے آزادی سے محبت کی ہے، چنانچہ میری محبت نے میرے اس عرفان کے ساتھ نمو پایا ہے کہ دنیا ظلم و جور اور ذلت و حقارت کی غلام ہے اور میرے اس ادراک کے ساتھ اس میں وسعت پیدا ہوئی ہے کہ وہ لوگ خوفناک بتوں کو پوجتے ہیں۔ جنہیں تاریک صدیوں نے تراشا ہے۔ مستقل جہالت نے نصب کیا ہے اور جن کے اطراف کو پجاریوں کے ہونٹوں کے لمس نے چمکایا ہے۔

لیکن میں آزادی کے ساتھ ساتھ ان غلاموں سے بھی محبت کرتا تھا۔ مجھے ان سے ہمدردی تھی۔ اس لیے کہ وہ اندھے ہیں۔ خونخوار درندوں کے جبڑوں کو بوسہ دیتے ہیں اور نہیں دیکھتے، جن سانپوں کا زہر چوستے ہیں۔ اور نہیں محسوس

کرتے، اپنے ہاتھوں سے اپنی قبریں کھودتے ہیں اور نہیں جانتے۔

میں نے آزادی کو ہر چیز سے زیادہ چاہا ہے، اس لیے کہ اُسے ایک دوشیزہ کے روپ میں دیکھا ہے، جسے تنہائی نے نڈھال کر دیا تھا۔ اور کس مپرسی نے گُم کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک لطیف پرچھائیں ہو گئی تھی۔ جو مکانوں مکانوں میں سے گزر کر سڑکوں کے موڑ پر آ کھڑی ہوتی تھی۔ اور لوگوں کو پکارتی تھی لیکن کوئی سُنتا تھا نہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھتا تھا۔

ان پچیس۲۵ برس میں مَیں نے تمام انسانوں کی طرح سعادت و کامرانی سے محبت کی ہے چنانچہ میں روزانہ اُٹھتا تھا اور عام آدمیوں کی طرح اس کی جستجو کرتا تھا، لیکن میں نے کبھی اُسے ان کی راہوں میں نہیں پایا، نہ کبھی ان کے محلوں کے آس پاس پڑی ہوئی خاک پر اس کا نقشِ قدم دیکھا اور نہ کبھی انکی عبادتگاہوں کی کھڑکیوں سے اس کی صدائے بازگشت آتے سُنی۔ لیکن جب کبھی اس کی تلاش کے دوران میں مجھے تنہائی نصیب ہوئی میں نے اپنی روح کو اپنے کانوں سے یہ سرگوشی کرتے سُنا۔

" سعادت، وہ دوشیزہ ہے، جو دل کی گہرائیوں میں پیدا ہوتی اور وہیں پروان چڑھتی ہے۔ یاد رکھو! وہ کبھی اپنے دائرہ سے باہر نہ نکلے گی "۔

جب میں نے سعادت کو دیکھنے کے لیے اپنے دل کے دروازے کھولے تو

وہاں اس کا آئینہ، اس کی مسہری اور اس کا لباس نظر آیا، لیکن وہ خود وہاں نہ تھی۔

میں نے انسانوں کو بھی چاہا ہے ــــ اور بہت چاہا ہے ــــ انسان میری شریعت میں تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو زندگی پر لعنت بھیجتے ہیں دوسرے وہ جو اسے نعمت سمجھتے ہیں اور تیسرے وہ جو اس پر غور کرتے ہیں۔ چنانچہ میں پہلی قسم کے انسانوں سے ان کی بدبختی کے پیشِ نظر دوسری قسم کے انسانوں سے ان کی دریا دلی کے سبب اور تیسری قسم کے انسانوں سے ان کے ادراک و عرفان کی بناء پر محبت کرتا رہا۔

اس طرح میں نے اپنی زندگی کے پچیس سال بسر کئے اور اس طرح میرے شب و روز ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے اور میری زندگی کی راہ میں پڑیاں ہو کر گرتے گذر گئے، جس طرح خزاں کی ہواؤں سے درخت کے پتے منتشر ہو جاتے ہیں ــــ

اور آج، اس تھکے ماندے رہگیر کی طرح، جو دشوار گذار گھاٹی کا نصف رستہ طے کر کے رک گیا ہو، میں کھڑا، کچھ یاد کر رہا ہوں، اپنے ارد گرد دیکھ رہا ہوں لیکن اپنی حیاتِ ماضی کا مجھے کوئی ایک نشان ایسا نظر نہیں آرہا جس کی طرف اشارہ کر کے میں یہ کہہ سکوں کہ یہ میرا ہے۔ مجھے اپنی زندگی کے مختلف

موسموں کا کوئی حاصل دکھائی نہیں دے رہا۔ سوائے سیاہ روشنائی سے دہتے دھبّے صفحات اور ٹیڑھی میڑھی لکیریں اور سوزوں ناموزوں رنگوں میں لتھڑی ہوئی عجیب غریب منتشر تصویروں کے۔ ان بکھرے ہوئے صفحات اور ان منتشر تصویروں میں میں نے اپنے فنکارانہ جذبات اور تصورات کو کفنا کر دفن کر دیا ہے۔ جس طرح کسان بیجوں کو زمین کے سینہ میں دفن کر دیتا ہے لیکن کسان جو کھیت میں جا کر بیجوں کو زمین کی تہوں میں ڈالتا ہے۔ شام کو جب تھکا ماندہ گھر واپس آتا ہے تو اس انتظار اور اس امید میں واپس آتا ہے کہ فصل کاٹنے کے موسم میں اس کا پھل مجھے ملے گا۔ اس کے برخلاف میں نے اپنے دل کے بیج بغیر کسی خواہش، بغیر کسی امید اور بغیر کسی انتظار کے ڈالے ہیں۔

اور اب کہ میں اپنی عمر کے اس مرحلہ پر پہنچ گیا ہوں جہاں سے میرا ماضی مجھے آہوں اور مایوسیوں کی کہر کے پیچھے نظر آ رہا ہے اور مستقبل ماضی کے پردہ میں لپٹا ہوا۔ میں ٹھہر کر اپنی کھڑکی کے شیشہ میں سے بستی پہ نظر ڈالتا ہوں اور لوگوں کے چہرے دیکھتا ہوں، فضا کی طرف بلند ہوتی ہوئی ان کی آوازیں سنتا ہوں، مکانوں سے آتی ہوئی ان کے قدموں کی چاپ سے گوش آشنا ہوتا ہوں اور ان کی روحوں کے لمس، انکی خواہشوں کے تموّج اور ان کے دل کی دھڑکنوں کو محسوس کرتا ہوں۔ نظر ڈالتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ لڑکے کھیل رہے ہیں اور ہنس ہنس کر، قہقہے

لگا لگا کر، ایک دوسرے کے منہ پر خاک ڈال رہے ہیں، دیکھتا ہوں کہ نوجوان عزم وہمت سے بھرپور، اس طرح سر اٹھائے چلے جا رہے ہیں، گویا سورج کی شعاعوں سے رنگین بادلوں کے کناروں پر لکھا ہوا جوانی کا قصیدہ پڑھ رہے ہیں۔ دیکھتا ہوں کہ نوخیز لڑکیاں اٹھلاتی، شاخوں کی طرح بل کھاتی، پھولوں کی طرح مسکراتی جا رہی ہیں اور نوجوانوں کو میلان اور توجہ کے اثر سے جھکتی ہوئی پلکوں کے پیچھے سے جھانک رہی ہیں۔ دیکھتا ہوں کہ خمیدہ کمر بوڑھے، لکڑی کے سہارے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں اور اُن کی نگاہیں زمین پر گڑی ہیں، گویا مٹی کے ذرّوں میں وہ جواہر تلاش کر رہے ہیں جو ہاتھوں نے کھو دیے ہیں۔

بس اپنی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر ان تمام تصویروں اور پرچھائیوں کو غور سے دیکھتا ہوں جو ساکن ہوتی ہیں اس لیے کہ چلتی ہیں اور منتشر ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ شہر کے گلی کوچوں اور بازاروں میں رینگتی ہیں۔

پھر میں شہر سے پرے نظر ڈالتا ہوں اور جنگل کو دیکھتا ہوں، اس کے جلال آگیں جمال، اس کی بولتی خاموشی، اس کے بلند ٹیلوں، اس کی گہری وادیوں، اس کے گھن دار درختوں، اس کی لہلہاتی گھاس، اس کے معطر پھولوں، اس کے مترنم دریاؤں اور اس کے چہچہاتے پرندوں کو دیکھتا ہوں۔

اس کے بعد میں جنگل سے پرے نظر ڈالتا ہوں اور سمندر کو دیکھتا ہوں۔ اس کی انوکھی چیزوں، اس کے دفینوں اور اس کے اسرار کو دیکھتا ہوں، اس کی سطح کی کف آگیں، غضب ناک، سبک رفتار اور بے پروا موجوں کو دیکھتا ہوں، اس کے بلند ہوتے ہوئے، پھیلتے ہوئے اور نیچے اترتے ہوئے بخارات کو دیکھتا ہوں اس میں تیرتی ہوئی دنیاؤں چمکتے ہوئے، ستاروں، چاند، سورج اور ثوابت و سیار کو دیکھتا ہوں۔ ان اجرامِ فلکی کی دفع و کشش کی ان قوتوں کو دیکھتا ہوں، جو صلح پسند ہیں۔ تصادم کار ہیں۔ اپنے وجود کے لیے دوسروں کی محتاج ہیں۔ اور تی بدلتی رہتی ہیں اور اس ناموس سے چمٹی ہوئی ہیں۔ جس کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا، جو ان عام معادی قوانین کی تابع ہیں، جن کے آغاز کا آغاز ہے نہ انجام کا انجام۔

میں ان تمام چیزوں کو اپنی کھڑکی کے شیشہ میں سے دیکھتا ہوں اور اُن پر غور کرتے وقت اپنی عمر کے پچیس برس کو بھول جاتا ہوں۔ ان سے پہلے جو صدیاں گزر چکی ہیں اور ان کے بعد جو صدیاں آنے والی ہیں۔ ان سب کو فراموش کر دیتا ہوں۔ میرا وجود، میرا دائرہ حیات اپنے تمام راز مجھ پر منکشف کر دیتا ہے، بچّے کی کراہ کے اس ذرّہ — چھوٹے سے چھوٹے حصّہ — کی شکل میں جو ازلی گہرائیاں، سرمدی بلندی اور ابدی حدود رکھنے والی خلاء میں لرزتا ہے لیکن مجھے اس ذرّہ — اس نفس — کے وجود سے اس ذات کا احساس ہو رہا ہے جسے

بیٹی "انا" کہتا ہوں، میں اس کی حرکت کو محسوس کر رہا ہوں اور اس کی چیخ سُن رہا ہوں کیونکہ وہ اس وقت اپنے بازوؤں کو اُوپر کی طرف اُٹھا رہی ہے، چاروں طرف ہاتھ مار رہی ہے، اس دن کی طرح لرزتی ہوئی مچل رہی ہے، جس دن وہ عالمِ وجود میں آئی تھی اور اپنی انتہائی پاکیزگیوں سے بلند ہوتی ہوئی آواز میں چلّا رہی ہے۔

"سلام! اے زندگی!
سلام! اے بیداری!
سلام! اے خواب!
سلام! اے زمین کی تاریکی کو اپنے نور سے روشن کر دینے والے دن!
سلام! اے انوارِ آسمانی کو اپنی تاریکی سے اُجاگر کرنے والی رات!
سلام! اے موسموں کی ملکہ!
سلام! اے زمین کی جوانی کو واپس لانے والی بہار!
سلام! اے سُورج کی عظمت کو عام کرنے والی گرمی!
سلام! اے کوششوں کا پھل اور محنتوں کا ثمر دینے والی خزاں!
سلام! اے اپنی شورشوں سے عزمِ فطرت کو کوٹانے والے جاڑے!
سلام! اے شب و روز کے اسرار کو بکھیرنے والے دور!
سلام! اے گزشتہ نسلوں کے بپا کردہ فساد کی اصلاح کرنے والی نسل!

سلام! اے ہمیں کمال کی طرف لے جانے والے زمانے!

سلام! اے زندگی کی رگاموں کو تھامنے والی روح! جو سورج کی نقاب میں ہم سے روپوش ہے!

سلام! اے دل! کہ تو آنسوؤں میں غرق ہونے کے باوجود امن و سلامتی سے جھل کر سکتا ہے۔

اور سلام! اے ہونٹو! کہ تم تلخی سے ذوق آشنا ہوتے ہوئے بھی امن و سلامتی کا نام لے رہے ہو۔"

ولادتِ مسیحؑ

میری محبوبہ! کل تک میں اس دنیا میں تنہا تھا اور تنہائی موت کی طرح بے رحم تھی۔ میں اُس پھول کی طرح اکیلا تھا، جو بلند چٹانوں کے سائے میں کھلا ہو۔ اس لیے زندگی کو میری ہستی کا احساس تھا، نہ مجھے زندگی کے وجود کا۔ لیکن آج میری روح بیدار ہوئی اور تجھے اپنے قریب کھڑے دیکھ کر پہلے ڈری پھر اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ اس کے بعد تیرے سامنے سجدے میں گر پڑی جس طرح تو بڑے کو شعلہ زن دیکھ کر زرتشت کا سر بسجود ہو گیا تھا۔

میری محبوبہ! کل تک ہوا کا لمس خشونت آمیز اور سورج کی شعاعیں کمزور تھیں۔ کُہر نے زمین کو چھپا رکھا تھا اور سمندر کی موجوں کا شور بجلی کی کڑک سے مشابہ تھا۔ میں گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا، لیکن مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا، سوائے میری دردناک ذات کے، جو میرے پہلو میں کھڑی تھی اور ظلمت کی اُن پرچھائیوں کے جو میرے گرد و پیش بھوکے کوّوں کی طرح کبھی زمین پر اُترتی تھیں، کبھی فضا میں پرواز کر جاتی تھیں۔

لیکن آج ہوا میں نرمی و لطافت ہے، نور نے فطرت کا دامن بھر دیا ہے موجیں ساکن ہیں، ابر و باد ل چھٹ گئے ہیں۔ اب میں جدھر نگاہ ڈالتا ہوں تجھے اور زندگی کے اسرار کو دیکھتا ہوں جو تیرے گرد اس طرح حلقہ کیے ہوئے ہیں جیسے پر نور پرسکون جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی میں نہانے اور ڈبکی لگانے سے اس کے جسم کے گرد ہالے پڑ جائیں۔

کل تک میں راتوں کے دل کا ایک خاموش کلمہ تھا۔ لیکن آج دنوں کی زبان کا فرحت بخش نغمہ ہو گیا ہوں اور یہ سب کچھ ایک —— صرف ایک لمحہ میں ہوا ہے وہ ایک لمحہ، جو ایک نظر، ایک کلمہ، ایک آہ اور ایک بوسہ سے مرکب ہے۔

میری پیاری! اس لمحہ نے میری روح کی سابقہ صلاحیتوں اور آئندہ آرزوؤں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اس لیے اب وہ گلاب کے اس سفید پھول کی مثال ہے، جو زمین کی تاریکی سے دن کی روشنی میں آ گیا ہو۔ یہ لمحہ میری تمام زندگی میں وہی درجہ رکھتا ہے، جو مسیح ؑ کی ولادت تمام صدیوں میں۔ اس لیے کہ وہ روح پاکیزگی اور محبت سے مملو ہے —— اس لیے کہ اس نے میری گہرائیوں میں ظلمت کو شعاع۔ غم کو خوشی اور بدبختی کو خوش بختی بنا دیا ہے۔

میری محبوبہ! محبت کے شعلے مختلف صورتوں اور نت نئی شکلوں میں آسمان سے لپٹیں مارتے اترتے ہیں، لیکن اس دنیا میں ان کا فعل اور ان کی تاثیر ایک

ہے۔ چنانچہ وہ چھوٹا سا شعلہ، جو کسی فردِ واحد کے دل کی خلاؤں کو روشن کرتا ہے، اس بڑے اور لپٹیں مارتے شعلے سے مشابہ ہے۔ جو بلندیوں سے اترتا ہے اور تمام قوموں کی تاریکیوں کو روشن کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ نفسِ احد کے عناصر، میلانات اور جذبات، انسانی جماعت کے عناصر، میلانات اور جذبات سے ذرہ برابر مختلف نہیں ہوتے۔

میری محبوبہ! یہودی اس عظیم القدر ہستی کا انتظار کر رہے تھے، جس کو بھیجنے کا وعدہ آغازِ آفرینش کے وقت کیا گیا تھا۔ تاکہ وہ انہیں انسان کی غلامی سے نجات دلائے۔ یونان میں ایک بزرگ روح دیکھ رہی تھی کہ مشتری اور منروا کی پرستش کمزور پڑ گئی ہے اور اب وہ روحوں کو روحانیت سے سیراب نہیں کر سکتی۔ روم میں ایک بلند فکر نے غور و تامل کے بعد سمجھ لیا تھا۔ کہ اپالو کی الوہیت جذبات سے دور اور وینس کا ابدی جمال بڑھاپے سے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ غرضکہ تمام قومیں نادانستہ طور پر، ان تعلیمات کے لیے روحانی گرسنگی محسوس کر رہی تھیں۔ جو مادی عوارض سے بلند ہوں۔ ان میں روح کی اس آزادی کے لیے ایک گہرے میلان کا شعور پیدا ہو گیا تھا، جو انسان کو اپنے ہمسائے کے ساتھ سورج کی روشنی اور زندگی کے حسن سے فرحت حاصل کرنا سکھائے۔

یہی ہے وہ حسین آزادی، جو انسان کو نوازتی ہے اور وہ تمام لوگوں کو اس امر پر مطمئن کر دینے کے بعد کہ انہیں کی بہتری اور بھلائی کے لیے وہ ان کے پاس آیا ہے، بغیر کسی خوف اور جھجک کے، ان دیکھی قوت سے قریب ہو جاتا ہے۔

میری محبوبہ! یہ سب کچھ ہزاروں برس سے تھا۔ جب انسانی دل کے جذبات، محسوسات کے گرد منڈلا رہے تھے اور اس ہمہ گیر وبے غیر فانی روح کے قریب جاتے ڈرتے تھے ــــ جب روحوں کا دیوتا ــــ پان چرواہوں کی روح کو رنج والم سے گراں بار کر رہا تھا اور سورج دیوتا ــــ بعل اپنے کاہنوں کے ہاتھوں سے بیچاروں اور کمزوروں کے دل دبوچ رہا تھا۔

لیکن ایک رات کو، نہیں، ایک گھنٹہ میں۔ نہیں، ایک لمحہ میں ــــ جو سلسلۂ ماہ وسال سے الگ ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ ماہ وسال سے قوی تھا۔ روح کے لب وا ہوئے اور ان سے وہ "کلمہ حیات" ادا ہوا، جو آغاز میں روح کے پاس تھا چنانچہ یہ کلمہ ستاروں کی روشنی اور چاند کی شعاعوں کے ساتھ اترا اور مجسم ہو کر ایک بچّہ کا روپ اختیار کر لیا، جو ایک چھوٹی سی جگہ جہاں درندگانِ شب کے خوف سے گڈریے اپنے مویشیوں کو بند کرتے تھے ایک انسان کی بیٹی کی آغوش میں کھیل رہا تھا۔

وہ بچہ، جو گائے بھینس کے سینگوں میں گھاس پھونس پر سوتا تھا۔
وہ بادشاہ، جو غلامی کے بوجھ میں دبے ہوئے قلب، روح کے بھوکے نفوس اور حکمت کے لیے ترسنے والے افکار سے بنے ہوئے تخت پر بیٹھا تھا۔

وہ شیر خوار بچہ، جو اپنی محتاج و بے کس ماں کے کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا، جس نے اپنے لطف و کرم کی بنا پر مشتری سے عصائے قوت چھینا اور اس غریب چرواہے کو عطا کر دیا، جو اپنی بھیڑ بکریوں میں گھاس کو تکیہ بنائے لیٹا تھا، جس نے اپنی رقت و رحم دلی کی بنا پر مزدا سے حکمت لی اور اس محتاج شکاری کی زبان کے حوالے کر دی، جو جھیل کے کنارے اپنی کشتی میں بیٹھا تھا، جس نے اپنے روحانی غم کی بناء پر اپالو سے عشرت حاصل کی اور شکستہ دل کو بخش دی، جو لکڑی کا سہارا لیے دروازوں کے سامنے کھڑا تھا، جس نے اپنے جمال کی بناء پر وینس کا جمال انڈیلا اور اس عورت کی روح میں بھر دیا جو ظالموں کے ظلم سے ڈری سہمی ذلت و کس مپرسی کے عالم میں پڑی تھی، جس نے اپنی عظمت و جبروت کی بناء پر بعل کو مسند سے اتارا اور اس کی جگہ اس مایوس و ناکام کسان کو بٹھا دیا، جو اپنے ماتھے کے پسینہ کے ساتھ کھیت میں بیج ڈالتا تھا۔

میری محبوبہ! کیا کل تک میرے جذبات اسرائیل کے پوتوں کی مثال نہ تھے؟

کیا میں رات کی خاموشی میں اُس نجات دہندہ کی آمد کے انتظار میں نہ تھا، جو مجھے زندگی کی غلامی اور اس کے مصائب سے آزاد کرائے ؟ کیا میں گذشتہ قوموں کی طرح شدید روحانی بھوک محسوس نہیں کر رہا تھا ؟ کیا میں اس بچّہ کی طرح جو غیر محلوں میں گم ہو گیا ہو، زندگی کی راہوں میں نہیں بھٹک رہا تھا ؟ کیا میری روح چٹان پر پڑے ہوئے اس بیج کی مثال نہ تھی جسے پرندہ نہ چُگ کر مار دیتا ہے اور عناصر منتشر کر کے جلا دیتے ہیں۔

میری محبوبہ ! یہ سب کچھ کل تک تھا، جب میرے خواب تاریکی کے گوشوں میں رینگتے اور روشنی کے قریب آتے ڈرتے تھے ـــــ جب مایوسی میری پسلیوں کو دوہرا کر دیتی تھی اور بے چینی پھر انہیں سیدھا کر دیتی تھی !

لیکن ایک رات کو، نہیں ! ایک گھنٹہ میں، نہیں ! ایک لمحہ میں ـــ جو میری زندگی کے ماہ و سال سے الگ ہو گیا تھا، اس لیے کہ میری زندگی کے ماہ و سال سے زیادہ حسین تھا ـــــ روح، نور کے بلند دائرہ کے مرکز سے اُتری، اپنی پلکوں کے پیچھے سے مجھے دیکھا اور اپنی زبان سے مجھ سے بات کی۔ اس نظر اور اس کلمہ سے محبت پیدا ہوئی اور میرے دلِ صدپارہ میں جلوہ فرما ہو گئی۔

اس عظیم الشان محبت نے جو میرے سینہ میں پیوست شدہ برچھی پر

رونق افروز ہے ـــــ اس حسین محبت نے جو عواطف و جذبات کے ہنالوں
میں لپٹی ہوئی ہے ـــــ اس نرم و نازک شیر خوار بچہ نے جو روح کے سینہ
پر اپنا سر رکھے ہے، میرے باطن میں غم کو خوشی، مایوسی کو مسرت اور تنہائی کو
جنّت بنا دیا ہے۔

اس جلیل القدر بادشاہ نے، جو ذاتِ معنوی کے تخت پر جلوس فرما ہے،
اپنی آواز سے میرے بے روح شب و روز کو حیاتِ تازہ بخش دی ہے، میری
آنکھوں کو جو تلخ و تیز آنسوؤں سے زخمی ہوگئی تھیں دوبارہ روشنی عطا کردی
ہے اور میری امیدوں کو اپنے داہنے ہاتھ سے کام لے کر مایوسی کے بھنور سے
نکال لیا ہے۔

میری محبوبہ! پہلے سارا زمانہ رات تھا، اب صبح صادق ہوگیا ہے اور
آگے چل کر دن ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اس بچہ ـــــ مسیح ـــــ کے انفاس
فضاء کے ذرّوں میں نفوذ کر گئے ہیں اور ایتھر کے اجزاء سے گھل مل گئے ہیں۔
پہلے میری زندگی غم تھی، اب خوشی ہوگئی ہے اور آگے چل کر سراپا عشرت و
آرام ہو جائے گی، اس لیے کہ اس بچے کے بازوؤں نے میرے دل کو جذب
اور میری روح کو ہم کنار کر لیا ہے۔

رُوحوں کی سرگوشی

اُٹھ! میری محبوبہ! اُٹھ!! کہ میری رُوح تجھے خوفناک سمندروں کے اُس پار سے پکار رہی ہے، اور میرا نفس کف آگیں اور غضبناک موجوں پر اپنے بازو تیری طرف پھیلا رہا ہے۔

اُٹھ! کہ حرکت سکوں آغوش ہو گئی ہے۔ سکوت نے گھوڑوں کی ٹاپ اور راہگیروں کے قدموں کی چاپ کو ختم کر دیا ہے اور نیند انسان کی رُوح سے گلے مل گئی ہے۔

صرف ایک میں جاگ رہا ہوں۔ نیند جس قدر مجھے غرق کرتی ہے اشتیاق اسی قدر مجھے اُبھارتا ہے، اور وسوسے جب مجھے تجھ سے دُور کرتے ہیں محبّت قریب کر دیتی ہے۔

میری محبوبہ! نسیان و فراموشی کی پرچھائیوں کے ڈر سے، جو لحاف کی تہوں میں پوشیدہ تھیں، میں اپنے بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا اور کتاب پھینک دی، اس لیے کہ میری آہ و فریاد نے اس کی سطریں مٹا ڈالی تھیں اور وہ

میری نگاہوں کے سامنے ایک سفید و سادہ کتاب رہ گئی تھی۔

اُٹھ! میری محبوبہ! اُٹھ اور میری سُن!!

—— میں یہاں ہوں، میرے حبیب! میں نے سات سمندر پار سے تیری آواز سُنی اور تیرے بازوؤں کا لمس محسوس کیا تو ایک دم چونک پڑی اور اپنی خلوت گاہ سے نکل کر ہری بھری گھاس کے تختے پر آ گئی۔ میرے پاؤں اور لباس کے دامن رات کی شبنم سے تر ہو گئے۔ دیکھ! میں اس پھولوں سے لدے پھندے بادام کے درخت کے نیچے کھڑی تیری روح کی پکار سُن رہی ہوں میرے پیارے!

—— بات کر! میری محبوبہ! اور لبنان کی وادیوں سے آنے والی ہوا کے ساتھ اپنے انفاس کو بہہ کر میرے پاس آنے دے!! بات کر! میرے سوا اور کوئی سُننے والا نہیں ہے! اس لیے کہ تاریکی نے ساری مخلوق کو اُس کے مسکنوں کی طرف بھگا دیا ہے اور نیند نے اہلِ شہر کو مدہوش کر دیا ہے۔ صرف ایک، میں ہوں، جو یہاں کھڑا جاگ رہا ہوں۔

—— آسمان نے چاند کی شعاعوں سے ایک باریک نقاب بُن کر لبنان پر ڈال دی ہے، میرے حبیب!

—— آسمان نے رات کی تاریکی سے ایک دبیز چادر تیار کر کے جس میں کارخانوں کے دھوئیں اور موت کے سانسوں کا استر لگا ہے، شہر کو اس میں چھپا دیا ہے، میری محبوبہ!

—— گاؤں کے رہنے والے بید اور اخروٹ کے درختوں سے گھری ہوئی جھونپڑیوں میں سو رہے ہیں اور ان کی روحیں خوابوں کی نزہت گاہوں کی طرف دوڑ رہی ہیں میرے پیارے!

—— مال و زر کے بوجھ نے انسان کی کمر جھکا دی ہے۔ حرص و طمع کے دشوار گزار راستوں نے اس کی رکابیں ڈھیلی کر دی ہیں، اور مصائب و آلام نے اس کی پلکوں کو بوجھل کر دیا ہے۔ اب وہ فرش پر پڑا ہے اور خوف و نومیدی کے سائے اس کے دل کو اذیت پہنچا رہے ہیں، میری پیاری!

—— گزشتہ نسلوں کی پرچھائیاں وادیوں میں گشت کر رہی ہیں اور پیغمبروں اور بادشاہوں کی روحیں ٹیلوں پر منڈلا رہی ہیں۔ میری فکر مجھے تصورات کے مرغزار میں لے گئی ہے اور کلدانیوں کی عظمت، اشوریوں کی شوکت اور عربوں کی فضیلت کا مشاہدہ کرا رہی ہے۔

—— چوروں کی تاریک روحیں گلیوں میں ماری ماری پھر رہی ہیں، کھڑکیوں کی درزوں میں سے خواہشوں کے سانپوں کے سر نظر آ رہے ہیں اور سڑکوں کے موڑ پر موت کی پھنکاروں سے گھلے ملے بیماریوں کے جراثیم اُڑ رہے ہیں۔ میرے تصوّر نے فراموشی کے پردے چاک کر دیے ہیں اور صادوم کی مکاریوں اور عاموره کی گناہ گاریوں کا منظر مجھے دکھا رہا ہے!

—— میرے حبیب! شاخیں جھوم رہی ہیں، انھوں نے وادی کی نہر کے ترنّم سے پیمانِ دوستی باندھ لیا ہے، اور میرے کانوں کو سلیمانؑ کی الاپ، داؤد کے رباب کی جھنکار اور موصلی کے نغموں سے نواز رہی ہیں۔

—— محلّے کے بچوں کی روحیں کانپ رہی ہیں، بھوک انھیں بے چین کیے دیتی ہے۔ غم و مایوسی کے بستر پر خوابیدہ ماؤں کے ٹھنڈے سانس تیزی سے رواں ہیں، اپاہجوں کے دل غربت و بدبختی کے خوابوں سے لرزے جاتے ہیں۔ اور تلخ آہیں اور نامکمل چیخیں سُن رہا ہوں، جو میرے سینہ کو نالہ و ماتم سے گراں بار کر رہی ہیں۔

—— نرگس اور سوسن کے پھول مہک رہے ہیں، یاسمین کی خوشبو بساں کی خوشبو سے ہم کنار ہو کر صنوبر کی پاکیزہ تر خوشبو سے آمیز ہو رہی ہے یہ تمام گھلی ملی خوشبوئیں ہوا کی لطیف موجوں کے ساتھ اونچے نیچے ٹیلوں اور بل کھاتی سڑکوں پر مچل رہی ہیں اور روح کو محبت سے لبریز کر رہی ہیں۔ اسے شوقِ پرواز عطا کر رہی ہیں۔

—— گھناؤنی گلیوں کی بدبو فضاء میں پھیلی ہوئی ہے اور بیماری کے جراثیم سے گھل مل کر باریک باریک خوف ناک تیروں کی طرح احساس کو چھید رہی ہیں اور ہوا کو مسموم کر رہی ہیں۔

—— دیکھ! میرے حبیب! صبح ہو گئی!! بیداری کی انگلیاں نیند کے پپوٹوں سے چہل کر رہی ہیں، بنفشئی شعاعیں پہاڑ کے پیچھے سے نمودار ہو کر بکھر گئی ہیں اور انہوں نے زندگی کی قوت و عظمت پر سے رات کا پردہ اُٹھا دیا ہے۔ وادی کے کناروں پر پھیلے ہوئے گاؤں جو آرام و سکون کو تکیہ بنائے سو رہے تھے، بیدار ہو گئے ہیں۔ کلیساؤں کے گھنٹے بج رہے ہیں اور نمازِ سحر کے آغاز کا اعلان کرتے ہوئے ایتھر کو ایک دلکش آواز سے لبریز کر رہے ہیں۔ غاران گھنٹوں کی جھنکار کو اس طرح دہرا رہے ہیں، گویا فطرت

اپنے تمام متعلقات کے ساتھ کھڑی نماز پڑھ رہی ہے۔ بچھڑے باڑے سے نکل آئے ہیں، اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ اپنی چار دیواری سے۔ اب وہ سر جھکائے چراگاہوں کی طرف جا رہے ہیں۔ جہاں شبنم کے قطروں سے چمکتی ہوئی گھاس چریں گے، آگے آگے چرواہے جوانی کا راگ الاپتے چلے جا رہے ہیں، اور ان کے پیچھے نوخیز لڑکیاں، صبح کے خیر مقدم میں چڑیوں کے ساتھ خدا کی حمد و ثنا کے گیت گا رہی ہیں۔

میری محبوبہ! صبح ہو گئی ہے۔ دن کا بھاری ہاتھ ایک دوسرے سے ملے ہوئے مکانوں پر پھیل گیا ہے۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹ گئے ہیں، اور دروازوں کے کواڑ کھل گئے ہیں، جس کی وجہ سے درشت چہرے اور خشمگیں آنکھیں نظر آنے لگی ہیں۔ قسمت کے مارے، کارخانوں کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کے جسموں میں ہم پہلو موت سکونت پذیر ہے اور سکڑے ہوئے خدوخال سے مایوسی اور خوف ٹپکے پڑ رہا ہے۔ گویا وہ زبردستی خوفناک اور ہلاکت آفریں میدانِ جنگ کی طرف لے جاتے جا رہے ہیں۔

دیکھو! سڑکیں عجلت کار لالچ کے بندوں سے بھر گئی ہیں اور فضا لوہے کے شور، پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ اور انجن کی سیٹیوں سے گونج رہی ہے۔ سارا

شہر میدانِ کارزار بن گیا ہے۔ جس میں طاقت ور کمزور کو پچھاڑ رہا ہے اور ظالم سرمایہ دار غریب مزدوروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔

—— میرے حبیب! یہاں زندگی کتنی حسین ہے، جیسے روشنی اور نزاکت سے بھرپور شاعر کا دل!

—— میری محبوبہ! یہاں زندگی کتنی بے رحم ہے جیسے گناہوں اور خوفناکیوں سے بھرا ہوا مجرم کا دل۔

اے ہوا

تُو کبھی تو خوشی کے نشہ میں چور، لڑکھڑاتی چلتی ہے اور کبھی شدتِ الم سے آہیں بھرتی گزر جاتی ہے۔ ہم تیری آواز تو سنتے ہیں لیکن تیرا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ تجھے محسوس تو کرتے ہیں، لیکن دیکھ نہیں سکتے۔ گویا تو محبت کا مظہر ہے۔ جو ہماری روحوں کو اپنی موجوں سے دھکیلتا ہے، لیکن ڈبوتا نہیں، ہمارے دلوں سے کھیلتا ہے لیکن ان میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔

تو ٹیلوں کے ساتھ چڑھتی، وادیوں کے ساتھ اترتی اور میدانوں اور چراگاہوں کے ساتھ پھیلتی ہے۔ تیرے چڑھنے میں عزم، اُترنے میں رقت اور پھیلنے میں خوش نمائی ہے۔ گویا تو رحم دل بادشاہ ہے، جو بے کس غریبوں سے رواداری سے کام لیتا ہے اور مغرور طاقت وروں کو اپنے اقتدار کا تماشا دکھاتا ہے۔

خزاں میں تو وادیوں میں روتی ہے اور تیرے رونے سے درخت بھی رونے لگتے ہیں۔ جاڑے میں تو شدت سے بھڑکتی ہے اور تیرے بھڑکنے سے

نطرت — تمام فطرت — بھی ہیجان میں آجاتی ہے۔ بہار میں تو بیمار و کمزور ہو جاتی ہے اور تیری کمزوری سے کھیت تندرست ہو جاتے ہیں۔ گرمیوں میں تو سکون اور آرام کی چادر میں چھپ جاتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ تو مردہ ہے جسے سورج نے اپنے تیروں سے مار کر اپنی حرارت میں کفنا دیا ہے۔

لیکن — کیا تو خزاں میں آہیں بھرتی ہے، یا درختوں کو ننگا ہو جاکر دینے کے بعد ان کی خجالت پر ہنستی ہے؟ کیا جاڑے میں غضب ناک ہوتی ہے یا راتوں کی برف سے ڈھکی شدہ قبروں کے گرد ناچتی ہے؟ کیا تو بہار میں بیمار ہوتی ہے، یا وہ محبوبہ بن جاتی ہے جسے ہجر و فراق نے گھُلا دیا ہو اور وہ اپنے محبوب — نوجوان فصول — کو نیند سے بیدار کرنے کے لیے اس کے چہرہ پر پھونکیں مار رہی ہو؟ کیا تو گرمیوں میں مردہ ہوتی ہے، یا پھلوں کے دل، انگوروں کی بیل اور ناکارہ کھجوروں کے ڈھیر میں جاگتی ہے؟

تو شہر کی گلیوں سے بیماریوں کے جراثیم اور ٹیلوں سے بیہودوں کی مہک لے کر اُڑتی ہے، اور یہی کام اُن بڑی بڑی ہستیوں کا ہے جو خاموشی سے زندگی کی تکلیفیں برداشت کرتے ہیں اور سکون و اطمینان اس کی مسرتوں سے

دو چار ہوتے ہیں۔

تو گلاب کے پھولوں سے سرگوشیاں کرتی ہے اور اُس سے وہ انوکھے بھید بتاتی ہے۔ جن کا مطلب سمجھ کر کبھی تو وہ بے چین ہوتا ہے اور کبھی مسکرانے لگتا ہے اور یہی دیوتا انسان کی روحوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

تو یہاں آہستہ آہستہ چلتی ہے، وہاں اپنی رفتار تیز کر دیتی ہے اور وہاں سے بڑھ کر دوڑنے لگتی ہے، لیکن ٹھہرتی کہیں نہیں اور یہی حال انسانی فکر کا ہے، جو حرکت سے زندہ رہتی ہے اور سستی و بے عملی سے مر جاتی ہے۔

تو جھیل کی سطح پر اشعار لکھتی ہے پھر مٹا ڈالتی ہے اور محتاط و ذمہ دار شاعر بھی یہی کرتے ہیں۔

تو جنوب سے محبت کی طرح گرم، شمال سے موت کی طرح ٹھنڈی، مشرق سے روحوں کے لمس کی طرح لطیف اور مغرب سے شدید نفرت کی طرح بسرعت تمام آتی ہے۔ کیا تو زمانہ کی طرح متغیر ہے؟ یا اطرافِ عالم کی قاصد ہے اور ان کا وہ پیغام ہم تک پہنچاتی ہے، جو وہ تجھ پر بھروسا کر کے تیرے سپرد کرتے ہیں؟

تو غضب ناک ہو کر ریگستانوں میں چلتی ہے اور انتہائی سنگ دلی سے قافلوں کو پامال کر کے ریگ کی تہوں میں انہیں دفنا دیتی ہے ——۔

توکیا تو ہی وہ مخفی سیال ہے، جو صبح کی شعاعوں کے ساتھ شاخوں کے پتوں میں دوڑ آتا ہے اور خوابوں کی طرح وادیوں کے موڑ پر تیزی سے بہتا ہے، جہاں بیگل تیرے شوق میں لہلہاتے ہیں اور گھاس تیرے انفاس سے مخمور ہو کر ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالتی ہے۔

تو ازراہِ ظلم، سمندروں میں ہیجان آفریں ہوتی ہے اور ان کی گہرائیوں کے سکون کو حرکت سے بدل دیتی ہے، یہاں تک کہ وہ بپھر جاتا ہے اور گرداب کی شکل میں اپنا مُنہ کھول کر جہازوں اور ان کے مسافروں کو ایک دم نگل جاتا ہے ـــ تو کیا تو ہی وہ محبت پیشہ ہُوا ہے، جو مکانوں کے آس پاس اُچھلنے کودنے والے بچوں کی لٹوں سے ازراہِ محبت کھیلتی ہے؟

آخر تو ہماری روحوں، آہوں اور سانسوں کو تیزی سے کہاں اڑائے لیے جا رہی ہے؟ ہماری مسکراہٹوں کے نقوش کو کہاں لے جانا چاہ رہی ہے؟ تو ہمارے دلوں کی اُڑتی ہوئی چنگاریوں کا کیا بنائے گی؟ کیا تو انہیں شفق سے پرے لے جا رہی ہے؟ یا مجبور و بے کس شکار کی طرح دور دراز غاروں اور خوف ناک کھڈوں کی طرف گھسیٹ رہی ہے، جہاں پہنچ کر تو انہیں دائیں بائیں دے مارے گی یہاں تک کہ ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا؟

رات کی خاموشی میں دل تجھ پر اپنے اسرار ظاہر کرتے ہیں اور صبح کے وقت آنکھیں، پلکیں جھپکا جھپکا کر تجھے اپنی آغوش میں جگہ دیتی ہیں —— تو کیا دلوں نے جو کچھ محسوس کیا اور آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، تجھے یاد ہے؟

فقیر اپنی پامالی کی صدائے بازگشت، یتیم اپنے دل کی سوزش اور غم کی ستائی عورت اپنے نالہ و ماتم، تیرے بازوؤں کے حوالے کرتی ہے اور غریب اپنی آہ، بے یار و مددگار اپنی کراہ اور فاحشہ اپنی روح کی پکار تیرے لباس کی تہہ میں رکھ دیتی ہے —— تو کیا تو اُن ذلت و حقارت کے ماروں کی امانتوں کی حفاظت کرتی ہے؟ یا اس زمین کی طرح ہے جو ہر چیز اپنے پیٹ میں رکھ لیتی ہے اور کچھ واپس نہیں کرتی؟

کیا تو یہ آواز، یہ فریاد، یہ شور اور یہ پکار سُن رہی ہے؟ یا اُن انسانوں کی مثال ہے، جن کی طرف ہاتھ پھیلتے ہیں اور وہ کوئی توجہ نہیں کرتے، جن کی سمت آوازیں بلند ہوتی ہیں اور وہ نہیں سُنتے؟

اسے سُننے والے کے لیے زندگی! کیا تو سُن رہی ہے؟

محبوب کی واپسی

رات ہونے سے پہلے دشمن کے سپاہی شکست کھا کر بھاگ گئے اس حالت میں کہ ان کی ٹیٹیں تلواروں اور نیزوں کے زخموں سے چھلنی تھیں اور فاتحین کا لشکر فخر و مسرت کے پھریرے اڑاتا اور گھوڑوں کی ٹاپوں پر — جو وادی کی کنکریوں پر ہتھوڑوں کی طرح پڑ رہی تھیں —— فتح و نصرت کے راگ الاپتا واپس ہوا۔

جب یہ لشکر ایک پہاڑی پر پہنچا تو چاند پہاڑ کے پیچھے سے طلوع ہو چکا تھا، اس کی لطیف روشنی میں وہ بلند چٹانیں ایسی معلوم ہو رہی تھیں، گویا افراد قوم کے ساتھ "سرپُرغرور" اونچا کیے کھڑی ہیں اور وادی میں جو صنوبروں کا جھنڈ تھا، وہ ایسا نظر آرہا تھا، گویا گزشتہ نسلوں نے لبنان کے سینہ پر ایک ایسا داغ ثبت کر دیا ہے۔

لشکر چلا جا رہا تھا، چاند کی شعاعیں سپاہیوں کے اسلحہ کو جگمگا رہی تھیں اور دور کے غاراں کی فتح و نصرت کے راگ دہرا رہے تھے۔ یہاں تک کہ

جب وہ گھاٹی کے آخری سرے پر پہنچے تو خاکستری چٹان پر کھڑے ہوئے ایک گھوڑے کی ہنہناہٹ نے —— جو چٹانوں کو پھاڑتی معلوم ہوتی تھی —— انھیں روک دیا، سپاہی اصل واقعہ کا پتہ لگانے کے لیے جب اس کے قریب پہنچے تو خون میں لتھڑی ہوئی ایک لاش پڑی پائی۔ یہ دیکھ کر لشکر کا سردار چلّایا،

"اس سپاہی کی تلوار مجھے دکھاؤ تا کہ میں اسے پہچانوں!"

چند سوار گھوڑے سے اُترے اور لاش کو چاروں طرف سے گھیر کر اسے ٹٹولنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک سپاہی سردار کی طرف متوجہ ہوا اور کرخت آواز میں کہنے لگا:

"اس کی بے جان انگلیاں تلوار کے قبضہ میں اس بری طرح پیوست ہیں کہ ان سے تلوار چھڑانی مشکل ہو گئی ہے!"

دوسرا بولا:

"تلوار گویا خون کی نیام میں ہے۔ اس کا فولاد تک نظر نہیں آرہا۔"

تیسرے نے کہا:

"خون اس کے ہاتھ اور تلوار کے قبضہ پر جم گیا ہے اور اس کا پنجہ اور تلوار کی دھار سے اس طرح چپٹا ہوا ہے گویا وہ دونوں ایک ہیں!"

سردار گھوڑے سے اُتر کر مقتول کے قریب گیا اور کہا:
"ذرا اس کا سر اُونچا کرو تاکہ چاند کی روشنی میں اس کا چہرہ دکھائی دے سکے۔"
سوار کے حکم کی تعمیل فوراً کی گئی۔ مقتول کا چہرہ جس سے ہمت جوانمردی اور تحمل کے آثار نمایاں تھے، موت کی نقاب میں سے جھلک رہا تھا

ایک نوجوان شہسوار کا چہرہ، جو زبانِ بے زبانی سے دَورِ مردانگی کی داستان سُنا رہا تھا غمگین اور مسرور چہرہ وہ چہرہ جس نے دشمن کا مقابلہ درشتی کے ساتھ اور موت کا مقابلہ مسکراتے ہوئے کیا

ایک لبنانی سورما کا چہرہ، جو اس دن کے معرکہ میں شریک ہوا اور اپنی آنکھوں سے فتح کے آثار دیکھے لیکن اپنے ساتھیوں کے ساتھ فتح و نصرت کے راگ گانے کے لیے زندہ نہ رہ سکا۔

جب اس کے سر سے رومال ہٹایا اور میدانِ جنگ کا گرد و غبار اس کے زرد چہرہ سے صاف کیا گیا تو سردار پر دہشت سی طاری ہو گئی اور اس نے دردناک آواز میں چلا کر کہا:
"اوہ! یہ تو ابن الصبحی ہے!"
سپاہیوں نے بھی آہ بھرتے ہوئے یہ نام دُہرایا اور چپ کے چپ رہ گئے، گویا بادۂ فتح و کامیابی سے مخمور دلوں کا نشہ ہرن ہو گیا ہے اور یہ

بات اب ان کی سمجھ میں آئی ہے کہ اس نوجوان کی موت سے جو نقصان انہیں پہنچا ہے، وہ فتح کے شرف اور کامیابی کی عزت سے زیادہ اہم ہے۔ اس ابتلاء نسان کی زبانوں پر قفل لگا دیا تھا اور وہ مقتول کے ارد گرد سنگ مرمر کی مورتیوں کی طرح ساکت و جامد کھڑے تھے۔

بہادروں اور سورماؤں کے دل پر موت کا یہی اثر ہوتا ہے اس لیے کہ گریہ و ماتم عورتوں کا شیوہ ہے اور واویلا بچوں کا کام۔ شمشیر بکف جنگ آزماؤں کو تو اس سکوت کے علاوہ کوئی چیز زیب ہی نہیں دیتی، جو وقار و جلال سے پُر ہو ـــــ وہ سکوت، جو ہمت دروں کو اس طرح دبوچتا ہے، جیسے عقاب کا پنجہ اپنے شکار کی گردن ـــــ وہ سکوت جو آنسوؤں اور فریاد سے بلند ہوتا ہے اور جس قدر بلند ہوتا جاتا ہے اسی قدر مصیبت کی ہولناکی اور بے رحمی بڑھتی جاتی ہے ـــــ وہ سکوت، جو بزرگ روح کو پہاڑ کی چوٹیوں سے سمندر کی تہوں میں دھکیل دیتا ہے ـــــ وہ سکوت جو طوفان کی آمد کا اعلان کرتا ہے اور طوفان کے نہ آنے پر خود اس کا فعل طوفان سے کہیں زیادہ شدید ہو جاتا ہے۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ موت نے اپنا ہاتھ کہاں رکھا ہے، نوجوان مقتول کے کپڑے اتارے گئے، اس کے سینے پر بھالوں کے زخم ایسے

معلوم ہورہے تھے، گویا کٹ آنگبیں ممنہ ہیں، جو اس رات کی خاموشی میں مردانہ ہمتوں کی داستان سنا رہے ہیں۔

سردار آگے بڑھا اور ازراہِ تجسس لاش پہ جھک گیا۔ اس کی نظر ایک زرکار رومال پہ پڑی جو نوجوان کے بازو سے بندھا تھا، سب کی نگاہیں بچا کر اس نے رومال کو غور سے دیکھا اور اس ہاتھ کو پہچان گیا جس نے اس کا ریشم تیار کیا تھا، ان انگلیوں کو پہچان گیا جنہوں نے اس کے تار بُنے تھے۔

سردار نے رومال اپنے کپڑوں میں چھپا لیا اور اپنا نمگین چہرہ لرزتے کانپتے ہاتھوں سے ڈھانپے ہوئے دو چار قدم پیچھے ہٹ گیا۔

وہ ہاتھ، جو اپنے عزم و قوت کی بنا پر دشمنوں کے سرتن سے علیحدہ کرتا تھا، اب کمزور پڑ گیا ہے، اس پر رعشہ طاری ہے اور وہ آنسو پونچھنے لگا ہے اس لیے کہ اس رومال سے چھو گیا ہے، جو ایک محبوبہ کی انگلیوں نے نوجوان کے بازو پر باندھا تھا ——— اس نوجوان کے بازو پہ جو اپنی شجاعت سے مجبور ہو کر لڑائی میں شرکت کے لیے آیا اور مارا گیا، اور اب اپنے رفقاء کے ہاتھوں پہ اپنی محبوبہ کے پاس جائے گا۔

سردار کے تصوّرات موت کے مظالم اور محبت کے اسرار کے درمیان گردش کر رہے تھے، کہ لاش کے گرد کھڑے ہوئے سپاہیوں میں سے

ایک نے کہا۔

"آؤ! اس شاہ بلوط کے نیچے اس کی قبر کھود دیں، اس کی جڑیں اس کا خون پی کر اور اس کی شاخیں اس کے جسم سے غذا حاصل کر کے طاقت ور اور غیر فانی ہو جائیں گی اور یہ درخت ان ٹیلوں کے لیے نوجوان کی شجاعت و بہادری کا جیتا جاگتا مرقع بن جائے گا!"

دوسرے نے کہا:

"نہیں اسے صنوبروں کے جھنڈ میں لے جا کر کلیسا کے قریب دفن کرنا چاہیئے، تاکہ اس کی ہڈیاں انتہائے آفرینش تک صلیب کے سائے میں محفوظ رہیں!"

تیسرا بولا:

"نہیں اسے وہیں دفن کرنا چاہیئے جہاں زمین اس کے خون سے لالہ زار ہوئی ہے۔ اس کی تلوار اس کی دائیں جانب رکھ دی جائے اور نیزہ اس کے پہلو میں گاڑ دیا جائے۔ گھوڑے کو اس کی قبر پر ذبح کر دینا چاہیئے، اور اس کے اسلحہ کو تنہائی میں اس کی غمگساری کے لیے رہنے دینا چاہیئے؟"

چوتھے نے مخالفت کی:

"نہیں نہیں!! دشمنوں کے خون میں رنگی ہوئی تلوار کو دفن نہ کرو۔

بے جگری سے موت کا مقابلہ کرنے والے گھوڑے کو موت کے گھاٹ اتارو، اوسان کے اسلحہ کو دشوار گزار مقام پر نہ چھوڑو جو لڑنے والے ہاتھوں اور مضبوط بازوؤں کے عادی ہیں۔ بلکہ ان تمام چیزوں کو اس کے عزیزوں کے پاس لے چلو کہ یہی اس کا بہترین ترکہ ہیں۔"

پانچویں نے کہا:

"آؤ ہم اس کے گرد کھڑے ہو کر نماز عیسوی ادا کریں تاکہ خدا اس کی مغفرت فرمائے اور ہماری فتح کو برکت دے!"

چھٹے نے رائے ظاہر کی:

"نیزوں اور ڈھالوں کا تابوت بنا کر ہمیں اسے اپنے کندھوں پر اٹھانا چاہیئے اور فتح و کامرانی کے راگ گاتے ہوئے وادی کا چکر لگانا چاہیے تاکہ وہ دشمنوں کی لاشوں کو دیکھے اور اس کے لب ہائے زخم مسکرائیں، اس سے پہلے کہ قبر کی مٹی انہیں گونگا کر دے!!

ساتویں نے کہا:

"آؤ! اسے اس کے گھوڑے پر سوار کریں اور مقتولوں کی کھوپریوں کے سہارے اسے بٹھائیں، اس کا نیزہ اس کے گلے میں لٹکا دیں اور کامیاب سپاہی کی طرح اسے شہر میں لے جائیں، اس لیے کہ اس نے اس وقت تک

اپنی جان موت کے حوالے نہیں کی، جب تک اس کی کمر پر دشمن کی روحوں کا بھاری بوجھ نہ لاد دیا۔ _

آٹھویں نے ایک نئی راہ پیدا کی :

" آؤ! اسے اس پہاڑ کی تہوں کے سپرد کر دیں ، یہاں غاروں کی صدائے بازگشت اس کی ندیم ہوگی، اور آبشاروں کا ترنم اس کا مونس و غمگسار اس لیے اس کی ہڈیاں اس جنگل میں راحت محسوس کریں گی، جہاں رات کے قدم بھی سُبک اور لطیف ہوتے ہیں!"

نویں نے اس تجویز کی نفی کی :

" نہیں! اسے یہاں نہ چھوڑو! چونکہ جنگل میں اُکتا دینے والی وحشت اور رحم ناآشنا تنہائی ہے، بلکہ آؤ! اور اسے گاؤں کے قبرستان میں دفن کر دو، وہاں اس کے آباؤ اجداد کی روحیں اس کی رفیق ہوں گی، رات کی خاموشی میں اس سے سرگوشیاں کریں گی اور اسے اپنی معرکہ آرائیوں اور عظمتوں کے قصّے سنائیں گی۔"

سردار آگے بڑھا اور ان کے بیچ میں کھڑے ہو کر ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش کیا :

" اسے لڑائیوں کی یاد سے پریشان نہ کرو اور اس کی روح کے کانوں

ہیں جو اس وقت ہمارے سروں پر اُڑ رہی ہے، تلواروں اور نیزوں کی باتیں نہ پہنچاؤ! بلکہ آؤ! اطمینان و خاموشی کے ساتھ ہم اسے اس کے وطن پہنچا دیں، چونکہ اس بستی میں ایک ہستی اس کی آمد کے انتظار میں جاگ رہی ہے —— ایک دوشیزہ کی ہستی، جو نیزوں کے ہجوم میں سے اس کی واپسی کا انتظار کر رہی ہے، ہمیں چاہیئے کہ اسے اس کے پاس پہنچا دیں تاکہ اس کے چہرہ پر نظر ڈالنے اور اس کی پیشانی کا بوسہ لینے سے محروم نہ رہ جائے؟

اشک آلود نگاہوں اور جھکے ہوئے سروں کے ساتھ سپاہیوں نے اس کی لاش اپنے کندھوں پر اٹھائی اور غم انگیز سکون کے ساتھ روانہ ہوئے۔ پیچھے پیچھے اس کا غم زدہ گھوڑا تھا، جو اپنی نگاہیں گھسیٹتا اور بار بار ہنہناتا چلا جا رہا تھا، غار اس کی آواز کا جواب اس طرح دے رہے تھے گویا دل رکھتے ہیں، جو حیوان کے ساتھ اذیت اور مایوسی کی شدت کا احساس کرتا ہے۔

اس وادی میں جہاں چاند کی شعاعیں دبے دبے پاؤں رکھتی ہیں، فتح کا جلوس، موت کے جلوس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا، اور اس کے آگے محبت کا سایہ اپنے شکستہ بازوؤں کو گھسیٹتا چل رہا تھا۔

حسینِ موت

ایم۔ای۔ایچ کے نام!

....

مجھے سونے دو! کہ میرا نفس محبت کے نغموں سے چُور ہے!

مجھے آرام کرنے دو! کہ میری روح روز و شب سے غم میں ہے۔ میرے پلنگ کے چاروں طرف شمعیں روشن کرو اور عود و لوبان سلگاؤ! میرے جسم پر گلاب اور نرگس کے پھولوں کی بارش کرو۔ میرے بالوں میں پسا ہوا مُشک بکھیرو! اور میرے قدموں میں خوشبوئیں انڈیل دو! اس کے بعد میری طرف دیکھو اور دستِ اجل نے جو کچھ میری پیشانی پر تحریر کیا ہے، اُسے پڑھو!

مجھے نیند کے بازوؤں میں غرق چھوڑ دو! کہ میری پلکیں اس بیداری سے تھک گئی ہیں۔

رباب چھیڑو اور اس کے نقرئی تاروں کی جھنکار میرے کانوں میں گونجنے دو!

شہنائیاں اور بانسریاں بجاؤ اور ان کے شیریں نغموں سے ایک چادر بُن کر میرے دل کے چاروں طرف تان دو، جو نہایت تیزی سے سکون کی طرف جا رہا ہے۔

مجھے لطیف و سُبک نغمے سناؤ اور میرے جذبات کے لیے ان کے طلسمی مطالب کا فرش بچھاؤ! اس کے بعد مجھ پر نگاہیں گاڑ دو اور میری آنکھوں سے امید کی شعاع نکلتے دیکھو!!

میرے دوستو! آنسو پونچھ ڈالو اور سر اٹھاؤ! جس طرح آمدِ سحر کے وقت پھول اپنے تاج اُٹھاتے ہیں، اور موت کی دُلہن میرے بستر اور فضاء کے درمیان روشنی کے ستون کی طرح کھڑے دیکھو!

سانس روک لو اور میرے ساتھ سفید بازوؤں کی پھڑپھڑاہٹ کان لگا کر سُنو!

میری ماں کے بیٹو، آؤ! اور مجھے رخصت کرو! مُسکراتے ہونٹوں سے میری پیشانی کو بوسہ دو!! اپنی پلکوں سے میرے ہونٹوں کو اور اپنے ہونٹوں سے میری پلکوں کو چُومو!!!

بچّوں کو میرے بستر کے پاس لاؤ اور اپنی گلاب جیسی نرم و نازک انگلیوں سے انہیں میری گردن چھونے دو! بزرگوں کو میرے قریب لاو تاکہ وہ اپنے سوکھے اور بے جان ہاتھ میری پیشانی پہ رکھ کر مجھے برکت دیں۔ محلّے کی لڑکیوں کو میرے پاس آنے دو!۔۔۔ انہیں موقع دو کہ وہ میری آنکھوں میں خدا کا پرتو دیکھیں اور میرے سانس کے ساتھ تیزی سے نکلتے ہوئے نغمۂ ابدیت کی صدائے بازگشت سنیں!!

جدائی

دیکھو! میں پہاڑ کی چوٹی پہ آ پہنچا اور میری روح آزادی و بے فکری کی فضاؤں میں اڑنے لگی۔

میرے جان سے عزیز بھائیو! میں اب تم سے دُور ——— بہت دُور ہو گیا ہوں۔ ٹیلوں کی بالائی سطح، کہر کے پردہ میں میری چشمِ بصیرت سے روپوش ہو گئی۔ وادی کی خلائیں سکون کے سمندر میں ڈوب گئی ہیں۔ سڑکیں اور گزرگاہیں نسیان و فراموشی کے ہاتھوں محو ہو گئی ہیں، درچراگاہیں جنگل اور گھاٹیاں ان پرچھائیوں کے پیچھے چھپ گئی ہیں، جو بہار کے بادلوں کی طرح سفید، سورج کی شعاعوں کی طرح زرد اور شام کے زیور ——— شفق ——— کی طرح سرخ ہیں۔

سمندر کی موجوں کے گیت ختم ہوگئے، سرسبز میدانوں میں نہروں کا ترنم فنا ہوگیا اور آبادی کے اطراف و جوانب سے اٹھنے والی صدائیں خاموش ہوگئیں۔ اب مجھے ترانہ سرمدیت کے سوا کچھ نہیں سنائی دیتا، جو میری روح کے میلانات سے ہم آہنگ ہے!

سکون

میرے جسم سے اُونی لباس اُتار کر اسے چنبیلی اور سوسن کے پتوں میں کفنا دو!

میری لاش کو ہاتھی دانت کے تابوت سے نکال کر نارنگی اور لیموں کے پھولوں کی مسند پر لٹادو! میری لاش پر ماتم نہ کرو! میری ماں کے بیٹو! بلکہ جوانی اور مسرت کے گیت گاؤ! میری موت پر آنسو نہ بہاؤ! اے سبزہ زاروں کی بیٹیو! بلکہ فصل کاٹنے اور شراب کشید کرنے کے دنوں کے راگ الاپو!!

میرے سینہ کو آہ و شیون سے گرانبار نہ کرو! بلکہ اپنی انگلیوں سے اس پر محبت کی تصویر اور خوشی کا نشان بناؤ!

افسونوں اور منتروں سے اثیر کے سکون و راحت کو برباد نہ کرو! بلکہ اس میں رہنے بسنے والوں کو میرے ساتھ بقائے دوام کی تمجید و تسبیح سے سرشار و شادماں ہونے دو!!

میرے غم میں سیاہ پوشی اختیار نہ کرو! بلکہ سفید کپڑے پہن کر میرے ساتھ خوشیاں مناؤ!!

ٹیکیاں لے لے کر میری موت کے واقعات بیان نہ کرو بلکہ اپنی آنکھیں بند کر کے دیکھو کہ میں اس وقت بھی تمہارے پاس ہوں، کل بھی ہوں گا، اور آئندہ بھی رہوں گا۔

مجھے سرسبز شاخوں پر لٹادو اور اپنے کندھوں پر اُٹھا کر آہستہ آہستہ ویران جنگل میں پہنچادو۔

مجھے قبرستان میں نہ لے جانا کہ لوگوں کی آمدورفت میرے آرام میں مخل ہوگی اور ہڈیوں اور کھوپریوں کے چٹخنے کی آوازیں میری نیند کے سکون کو برہم کردیں گی۔

مجھے سرو کے جھنڈ میں لے چلو اور میری قبر اس جگہ کھودو، جہاں گلِ لالہ کے پہلو میں بنفشہ کے پھول کھلتے ہیں۔

میری قبر گہری کھودنا! کہیں ایسا نہ ہو کہ سیلاب میری ہڈیوں کو وادی میں بہالے جائے!!

میری قبر چوڑی کھودنا! تاکہ رات کے سائے آکر میرے پاس بیٹھ سکیں۔ یہ کپڑے اُتار دو اور مجھے برہنہ کر کے سکون و اطمینان کے ساتھ زمین میں

میری ماں کے سینہ پر لٹا دو۔

مجھے نرم نرم مٹی میں دبا دو اور خاک کی ہر مٹھی کے ساتھ تھوڑے سے نسرین، یاسمین اور سوسن کے بیج میری قبر پر ڈال دو تاکہ وہ میرے جسمانی عناصر کو چوس کر اگیں، نمو پاکر میرے دل کی خوشبو فضاء میں بکھیریں، بلند ہو کر میرے سکون و آرام کے اسرار کی ترجمانی کریں اور ہوا کے ساتھ لہرا کر رہگیروں کو میرے خواب و خیال کے ماضی کی داستان سنائیں!

میرے پیارے بھائیو!! اب مجھے چھوڑ دو —— اب مجھے تنہا چھوڑ دو اور دبے پاؤں یہاں سے چلے جاؤ جس طرح خاموشی غیر آباد وادیوں میں چلتی ہے!

مجھے اکیلا رہنے دو اور میرے پاس سے آہستہ آہستہ منتشر ہو جاؤ۔ جس طرح بادام اور سیب کے پھول اپریل کی ہواؤں سے منتشر ہو جاتے ہیں۔ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو جاؤ! وہاں تمہیں وہ چیز ملے گی جسے موت مجھ سے اور تم سے نہیں چھین سکتی۔

اب اس جگہ کو چھوڑ دو، کیونکہ جس کی تمہیں تلاش ہے، وہ اس عالم سے دُور —— کوسوں دُور —— ہو گیا ہے!

گیت

میری روح کی گہرائیوں میں کچھ گیت ہیں، جو الفاظ کا جامہ پہننے پر راضی نہیں ہوتے۔ وہ میرے دل میں جاگزیں ہیں اس لیے روشنائی کے ساتھ کاغذ کے صفحہ پر منتقل ہونا نہیں چاہتے، ایک شفاف غلاف کی طرح میرے جذبات کو محیط ہیں اس لیے لعابِ دہن کی طرح کبھی زبان پر نہیں آئیں گے۔

میں انہیں ٹھنڈے سانس بھر کر کس طرح گنگناؤں؛ جبکہ مجھے ڈر ہے کہ وہ پیتھر کے ذرات میں کھو جائیں گے۔ میں اپنے گیت کسے سناؤں جبکہ وہ میرے خانۂ روح میں رہنے کے عادی ہیں۔ اور مجھے خوف ہے کہ اُن سے کانوں کی درشتی برداشت نہ ہو سکے گی۔

اگر تو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تو ان گیتوں کے سائے کی پرچھائیں دیکھ سکتا ہے، اور اگر تو میری انگلیوں کی بالائی پوروں کو مس کرے تو ان گیتوں کی لہر محسوس کر سکتا ہے۔

وہ تمام کام، جن کا تعلق میرے ہاتھوں سے ہے، ان گیتوں کو اس

طرح ظاہر کرتے ہیں جس طرح جھیل میں ستاروں کی روشنی کا عکس پڑتا ہے اور میرے آنسو ان کا راز اس طرح فاش کرتے ہیں جس طرح شبنم کے قطرے حرارت سے پریشان ہو کر گلاب کے پھول کا راز فاش کر دیتے ہیں۔

یہ وہ گیت ہیں جنہیں خاموشی پھیلاتی ہے اور ہنگامہ سمیٹ دیتا ہے۔

—— ہاں یہ وہ گیت ہیں، جنہیں خواب دہراتے ہیں اور بیداری چھپا دیتی ہے۔

لوگو! یہ محبت کے گیت ہیں —— پھر ہے کوئی اسحٰق موصلی جو انہیں گائے نہیں! بلکہ ہے کوئی داؤدؑ جو انہیں غیر فانی ترنم سے پڑھے۔

ان راگوں میں چنبیلی کے پھولوں سے زیادہ مہک ہے —— پھر ہے کوئی گلا، جو انہیں اپنا سکے؟

یہ راگ دوشیزہ کے راز سے زیادہ محفوظ ہیں —— پھر ہے کوئی تار جو ان کا بھید کھول سکے؟

کون ہے، جو سمندر کی گرج کو بلبل کے نغمے سے ہم آہنگ کر سکے؟ اور کون ہے جو آندھیوں کے شور کو بچہ کے ٹھنڈے سانس سے ہم رشتہ کر سکے؟

ہے کوئی انسان، جو دیوتاؤں کے نغمے اپنے گلے سے ادا کر سکے؟!

موج کا گیت

میں اور ساحل، دو ایک دوسرے کو چاہنے والے ہیں، جنہیں جذبۂ شوق ملاتا ہے اور موج ہوا جدا کر دیتی ہے۔ میں فضائے نیلگوں کے پیچھے سے اس لیے آتی ہوں کہ اپنے جھاگوں کی چاندی کو اس کے ریگ کے سونے سے ملا دوں اور اس کے دل کی گرمی کو اپنی رطوبت سے ٹھنڈا کر دوں۔

بحرِ دم میں فریفتگی کے اصول و قواعد اپنے محبوب کو سناتی ہوں اور وہ مجھے اپنے سینہ سے چپٹا لیتا ہے۔ شام ہوتے میں نغمۂ شوق چھیڑتی ہوں اور وہ مجھے بوسہ دیتا ہے۔

میں بے چین اور بیقرار ہوں لیکن میرا محبوب صبر کا حلیف اور تحمل کا دوست ہے!

جب سمندر میں چڑھاؤ آتا ہے تو میں اپنے محبوب سے گلے ملتی ہوں اور جب چڑھاؤ کی جگہ اتار لے لیتا ہے تو میں اس کے قدموں میں گر جاتی ہوں۔

ہوں۔

میں جل پریوں کے گرد بارہا ناچی ہوں، جب وہ گہرائیوں سے اُبھر کر ستاروں کا تماشا دیکھنے چٹانوں پر آ بیٹھتی تھیں۔ میں نے عاشقوں کو حسینوں کی شکایت کرتے بہت سنا ہے اور نالہ و شیون میں ان کا ساتھ بھی دیا ہے۔ میں چٹانوں کی اکثر ندیم رہی ہوں لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ میں نے ہنس ہنس کر انہیں بہت چھیڑا ہے لیکن ان کے لبوں پر مسکراہٹ تک نہ آتی۔ میں نے متعدد بار انسانوں کو بھنور سے نکال کر زندگی کے ساحل پر پہنچایا ہے۔ میں نے اکثر گہرائیوں سے موتی چرا کر حسن و جمال کی دیویوں کو نذر کئے ہیں۔

رات کی خاموشی میں جب ساری مخلوق نیند کے سائے سے ہمکنار ہوتی ہے، میں گاتے اور روتے جاگتی رہتی ہوں —— آہ! اسی بیداری نے مجھے تباہ کر دیا! لیکن میں محبت پیشہ ہوں اور محبت کی حقیقت بیداری ہے۔

یہ ہے میری زندگی اور یہ ہے میری زندگی کا فرض!

بارش کا گیت

میں وہ چاندی کے تار ہوں، جنہیں دیوتا بلندیوں سے پھینکتے ہیں، اور فطرت انہیں لپک کر ان سے وادیوں کی آرائش کرتی ہے۔

میں تاج عشتروت کے بکھرے ہوئے حسین موتی ہوں جنہیں بنت سحر نے چرا کر ان سے کھیتوں کو آراستہ کیا ہے۔

میں روتی ہوں تو ٹیلے مسکرانے لگتے ہیں، گرتی ہوں تو پھول سر بلند ہو جاتے ہیں۔

بادل اور کھیت ایک دوسرے پر مرتے ہیں اور میں ان دونوں کے درمیان ایک معتبر قاصد ہوں۔ چنانچہ برستی ہوں تو کھیتوں کی پیاس بجھاتی ہوں اور بادلوں کا بوجھ ہلکا کرتی ہوں۔

گرج کا نقارہ اور بجلی کی تلواریں میری آمد کی خوشخبری سناتی ہیں اور قوس قزح میرے اتمام سفر کا اعلان کرتی ہے ——— جس طرح دنیوی زندگی غضب ناک مادّہ کے قدموں سے شروع اور پُرسکون موت کے ہاتھوں

میں ختم ہوتی ہے۔

میں سمندر کے دل سے اُٹھ کر ایتھر کے بازوؤں پر اڑتی ہوں اور جہاں کوئی خوبصورت مرغزار دیکھتی ہوں، اس کے پھولوں کو چومتی اور اس کی شاخوں کو گلے لگاتی ہوں۔

خاموشی میں اپنی لطیف انگلیوں سے میں کھڑکیوں کے شیشے کھٹکھٹاتی ہوں اور اس طرح جو نغمہ پیدا ہوتا ہے اسے حسّاس طبیعتیں سمجھتی اور اس سے لطف حاصل کرتی ہیں۔

ہوا کی حرارت مجھے پیدا کرتی ہے اور میں ہوا کی حرارت کو فنا کر دیتی ہوں ـــــ جس طرح عورت اسی قوت کے ذریعے مرد پر غالب آتی ہے جو اس نے مرد سے حاصل کی ہے۔

میں سمندر کا ٹھنڈا سانس، آسمان کا آنسو اور سبزہ زار کا تبسّم ہوں۔ جس طرح محبت جذبات کے سمندر کا ٹھنڈا سانس، تفکر کے آسمان کا آنسو اور روح کے سبزہ زار کا تبسّم ہے!

حُسن کا گیت

میں محبت کی نشانی، روح کی شراب اور دل کی غذا ہوں!

میں گلاب کا پھول ہوں، صبح سویرے اپنے دل کے دروازے کھولتا ہوں اور دوشیزہ مجھے توڑ کر پہلے بوسہ دیتی ہے، پھر اپنے سینہ سے چمٹا لیتی ہے۔

میں سعادت و کامرانی کا گھر، فرحت و خوشی کا سرچشمہ اور آرام و راحت کا مرکز ہوں۔

میں نوخیز حسینہ کے لبوں کا لطیف تبسم ہوں، نوجوان مجھے دیکھ کر اپنی ساری تکلیفیں بھول جاتا ہے اور اس کی زندگی خوشگوار خوابوں کی تماشا گاہ بن جاتی ہے۔

میں شاعروں کا ملہم، مصوّروں کا ہادی اور موسیقاروں کا معلّم ہوں۔

میں بچّہ کی آنکھ کی وہ نگاہ ہوں جسے دیکھ کر مہربان ماں سجدہ میں گر پڑتی ہے، دُعا مانگتی ہے اور خدا کی حمد و ثنا کرتی ہے۔

میں آدم ؑ کے لیے حوّا ؑ کے جسم میں چمکا اور اسے اپنا حلقہ بگوش بنالیا۔
میں سلیمان کے لیے اس کی محبوبہ کے قد میں ظاہر ہُوا اور اسے حکیم و شاعر بنادیا۔

میں ہیلانہ کے لیے مسکرایا اور ترمدلاوہ کو ویران کردیا۔

میں نے قلاپطرہ کو تاج پہنایا اور محبت وادئ نیل میں عام ہوگئی۔

میں زمانہ کی طرح آج بناتا ہوں اور کل ڈھادیتا ہوں۔

میں خدا ہوں، خود ہی جلاتا ہوں، خود ہی مارتا ہوں۔

میں اپنی مہک میں بنفشہ کے پھول سے زیادہ لطیف ہوں!

میں طوفان سے زیادہ شدید ہوں۔

میں حقیقت ہوں! اے لوگو، میں حقیقت ہوں!! اور یہ تمہاری تمام معلومات سے بہتر ہے!!

سعادت کا گیت

انسان میرا محبوب ہے اور میں، انسان کی محبوبہ! میں اس کی مشتاق ہوں اور وہ مجھ پر جان دیتا ہے، لیکن، افسوس! میری اس محبت کے سلسلہ میں ایک رقیب بھی ہے جو میری بدقسمتی اور اس کی تکلیف کا سبب ہے۔ وہ ایک تمرّد پسند فساد ہے جسے دنیا "مادہ" کے نام سے پکارتی ہے جہاں ہم جاتے ہیں وہ ہمارے ساتھ جاتا ہے اور رقیب کی طرح ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیتا ہے۔

میں اپنے محبوب کو جنگل میں درختوں کے نیچے اور جھیلوں کے کنارے تلاش کرتی ہوں لیکن وہ مجھے نہیں ملتا، اس لیے کہ مادہ اسے بہکا سکھا کر شہر لے گیا ہے، جہاں مجمع ہے، فساد ہے اور بدبختی ہے!

میں اُسے معرفت کی درس گاہوں اور حکمت کے عبادت کدوں میں ڈھونڈتی ہوں لیکن نہیں پاتی، اس لیے کہ مادہ جو مٹی کا لباس پہنتا ہے —— اسے انانیت کے قلعہ میں لے گیا ہے، جہاں بے انتہا مصروفیت رہتی ہے۔

میں اس کی جستجو قناعت کے سبزہ زار میں کرتی ہوں، لیکن مجھے نظر نہیں آتا،

اس لیے کہ میرے رقیب نے اسے حرص و طمع کے غاروں میں قید کر دیا ہے۔

میں اسے گجردم، جب مشرق مسکراتا ہے، پکارتی ہوں، لیکن وہ میری آواز نہیں سنتا اس لیے کہ تجمل پسندی کی نیند نے اس کی پلکوں کو بھاری کر رکھا ہے۔

شام کے وقت جب ہر طرف خاموشی کارفرما ہوتی ہے اور بھول نیند کی آغوش میں آسودہ ہیں اس سے چہل کرتی ہوں لیکن وہ پروا نہیں کرتا، اس لیے کہ اس کا دل آنے والے واقعات میں اُلجھا رہتا ہے۔

میرا محبوب مجھ سے محبت کرتا ہے —— اپنے اعمال میں مجھے تلاش کرتا ہے لیکن وہ مجھے اعمالِ خداوندی کے سوا کہیں نہ پائے گا۔ وہ مجھ سے اس عظیم الشان محل میں ملنا چاہتا ہے جس کی بنیاد کمزوروں کی کھوپڑیوں اور سونے چاندی پر رکھی گئی ہے، لیکن میں اس سے سادگی کے گھر کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتی جسے دیوتاؤں نے جذبات کی نہر کے کنارے بنایا ہے۔ وہ مجھے قاتلوں اور باغیوں کے سامنے پیار کرنا چاہتا ہے لیکن وہ میرے لبوں کو تنہائی میں پاکیزگی کے پھولوں کے درمیان ہی چوم سکتا ہے وہ اپنے اور میرے درمیان مکر و مصلحت کو وسیلہ بنانا چاہتا ہے لیکن میں پاک عمل —— حسین عمل کے سوا کوئی وسیلہ گوارا نہیں کرتی۔

میرے محبوب نے میرے مادہ سے چیخ پکار اور ہنگامہ و شر سیکھا ہے لیکن میں اُسے چشم روح سے ہمدردی کے آنسو بہانا اور قناعت کی آہیں بھرنا سکھاؤں گی!

میرا محبوب میرے لیے ہے اور میں اپنے محبوب کے لیے!!

پھُول کا گیت

میں وہ کلمہ ہوں، جسے فطرت نے اپنی زبان سے ادا کیا، پھر واپس لے کر اپنے دل کی تہوں میں چھپا لیا اور اس کے بعد دوبارہ ادا کیا۔

میں وہ ستارہ ہوں جو نیلگوں خیمہ سے سبز بساط پر اُترا۔

میں عناصر کا نورِ چشم ہوں، جس کا نطفہ رحمِ سرما میں قرار پایا جو بطنِ بہار سے پیدا ہُوا، جسے آغوشِ گرما نے پروان چڑھایا اور دستِ خزاں نے سلا دیا۔

میں عاشقوں کا تحفہ ہوں۔

میں شادی کا تاج ہوں۔

میں زندہ کی طرف سے مُردے کی خدمت میں آخری پیشکش ہوں۔

میں صبح سویرے نُور کی آمد آمد کے اعلان میں نسیم کا معاون ہوں اور شام کو اسے رخصت کرنے میں پرندوں کا شریک۔

میں میدانوں میں لہلہا کر انہیں زینت بخشتا ہوں اور ہوا میں سانس لے کر اُسے مہکاتا ہوں۔

میں نیند سے چھڑتا ہوں اور رات کی بیشمار آنکھیں مجھ پر گڑ جاتی ہیں اور بیداری طلب کرتا ہوں تاکہ دن کی ایک آنکھ میں آنکھیں ڈال دوں۔

میں شبنم کی شراب پیتا ہوں، کوئل کے نغمے سُنتا ہوں اور گھاس کی تالیوں پر ناچتا ہوں۔

میں مشاہدۂ نور کے لیے ہمیشہ بلندی کی طرف دیکھتا ہوں، اپنے سائے پر کبھی نظر نہیں ڈالتا اور یہ وہ حکمت ہے جسے انسان نے اب تک نہیں سیکھا۔

انسان کا ترانہ

"تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا، اب وہ تمہیں مارے گا، پھر جلائے گا اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔" (قرآن شریف)

....

میں ازل میں تھا، اب ہوں، اور ابد تک رہوں گا۔ میرے وجود کی کوئی انتہا نہیں۔

میں غیر محدود فضا میں اڑا، عالم خیال میں صرف پرواز رہا، نور کے بلند دائرہ سے قریب ہوا لیکن اب مادّہ کا اسیر ہوں۔

میں نے کنفیوشس کی تعلیمات سنیں، برہما کے فلسفہ پر دھیان دیا اور "شجرِ عرفان" کے سائے میں بدھ کے پاس بیٹھا لیکن اب جہل و انکار کی کشمکش میں مبتلا ہوں۔

میں طور پر تھا جب "حسنِ مطلق" نے موسیٰؑ کے لیے اپنے چہرہ سے نقاب سرکائی۔ میں نے اردن کی گذرگاہوں میں مسیح ناصری کے معجزات دیکھے اور مدینہ طیبہ میں رسولِ عربیؐ کے اقوال سنے لیکن اب حیرت میں گرفتار ہوں۔

میں نے بابل کی قوت، مصر کی بزرگی اور یونان کی عظمت دیکھی، لیکن اب تک مجھے تمام اعمال میں کمزوری، ذلّت اور بے بضاعتی کار فرما نظر آتی ہے۔
میں "حیتمۂ دوور" کے جادوگروں، اشور کے کاہنوں اور فلسطین کے پیغمبروں کی صحبت میں بیٹھا، لیکن برابر حقیقت کا راگ گاتا رہا۔
میں نے اس حکمت کو حفظ کیا جو ہندوستان پہ نازل ہوئی، وہ اشعار یاد کئے جو جزیرۂ عرب کے رہنے والوں کے دل سے پھوٹے اور اس موسیقی کو غور سے سُنا جو اہلِ مغرب کے جذبات سے مجسم ہوئی، لیکن اندھا کا اندھا اور بہرہ کا بہرہ ہی رہا، جو کچھ دیکھ سکتا ہے نہ سُن سکتا ہے
میں نے لالچی فاتحین کی سنگ دلی برداشت کی، ظالم حاکموں کا ظلم اور سرکش قوت والوں کی غلامی جھیلی، لیکن اب بھی مجھ میں اتنی قوت ہے کہ زمانہ کا مقابلہ کر رہا ہوں
میں نے یہ سب کچھ دیکھا اور سُنا ہے۔ حالانکہ میں بچّہ ہوں، ابھی میں جوانی کے اعمال و واقعات دیکھوں گا، ابھی میں بوڑھا ہوں، کمال کو پہنچوں گا اور خدا کی طرف لوٹوں گا۔
میں ازل میں تھا، اب ہوں اور ابد تک رہوں گا۔ میرے وجود کی کوئی انتہا نہیں!

شاعر کی آواز

قوّت میرے دل کی گہرائیوں میں بوئی جاتی ہے جنہیں میں کاٹتا ہوں اور گیہوں کے خوشے جمع کر کے ڈھیر کے ڈھیر بھوکوں کو دیتا ہوں ——— روح اس چھوٹی سی انگور کی بیل کو زندگی بخشتی ہے اور میں اس کے خوشوں کو نچوڑ کر پیاسوں کو پلاتا ہوں ——— آسمان اس چراغ کو تیل سے بھرتا ہے اور میں اسے روشن کر کے اپنے گھر کی کھڑکی میں رکھ دیتا ہوں تاکہ رہگیر رات کی تاریکی میں ٹھوکریں نہ کھائیں۔ میں یہ کام اس لیے کرتا ہوں کہ انہیں سے میری زندگی ہے اگر دن مجھے ان کاموں سے روک دیں اور راتیں میرے ہاتھ باندھ دیں تو میں موت کی تمنا کرنے لگوں گا، اس لیے کہ اپنی اُمت کے ٹھکرائے ہوئے نبی اور اپنے عزیزوں میں انجان شاعر کے لیے موت ہی بہتر ہے۔

لوگ طوفان کی طرح چیختے اور شور مچاتے ہیں اور میں خاموشی کے ساتھ ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوں۔ اس لیے کہ میں نے دیکھا ہے، طوفان کی شدت و تندی زائل ہو جاتی ہے اور زمانہ کا گرداب اُسے چٹ کر جاتا ہے لیکن ٹھنڈا سانس نقدیر

الوہیت کے ساتھ باقی رہتا ہے۔

لوگ برف جیسے ٹھنڈے مادہ سے چمٹتے ہیں اور میں محبت کے شعلہ کو اپنے سینہ سے لگانے کے لیے اس کی تمنا کرتا ہوں تاکہ وہ میری پسلیوں اور اعضائے جسم کو ایک لے۔ اس لیے کہ میں نے دیکھا ہے۔ مادہ انسان کو بغیر کسی "تکلیف" کے مارتا ہے اور محبت اسے درد و الم کے ساتھ زندگی بخشتی ہے۔

لوگ متعدد خاندانوں اور قبیلوں میں منقسم اور مختلف ملکوں اور علاقوں سے منسوب ہیں لیکن میں اپنے تئیں ایک شہر میں اجنبی اور ایک امت سے خارج سمجھتا ہوں۔ ساری زمین میرا وطن اور انسانی جماعت میرا خاندان ہے اس لیے کہ میں نے انسان کو کمزور پایا ہے اور یہ ذلت ہی کا اثر ہے کہ وہ اپنی ذات کو تقسیم کرتا ہے۔ میں نے زمین کو تنگ دیکھا ہے اور یہ جہالت ہی ہے کہ اسے مختلف حکومتوں اور مملکتوں میں بانٹا جائے۔

لوگ روح کے عبادت کدوں کو ڈھانے میں ایک دوسرے کے ہمدوش اور جسمانی مدارس تعمیر کرنے میں ایک دوسرے کے معاون ہیں، لیکن میں تنہا کھڑا ان سب پر ماتم کر رہا ہوں، اس لیے کہ میں کان لگاتا ہوں اور اپنے باطن سے یہ پُر امید آواز نکلتے سنتا ہوں۔

"جس طرح محبت قلب انسانی کو درد و تکلیف پہنچا کر زندہ رکھتی ہے اسی

طرح جہالت اسے معرفت کے راستے دکھاتی ہے۔ اس بنا پر تکلیف اور جہالت
• دونوں عظیم لذت اور کامل معرفت کی طرف لوٹتی ہیں۔ غیر فانی حکمت نے
زیر آفتاب کوئی چیز بے کار پیدا نہیں ہے۔

(۲۱)

میں اپنے ملک کا، اس کے حسن اور اپنے ہم وطنوں کا ان کی بدبختی کی بنا پر مشتاق ہوں، لیکن جب میری قوم اس جذبہ سے مجبور ہو کر جسے وہ "وطنیت" کہتی ہے، میرے کسی قریبی وطن پر حملہ کرتی ہے، اس کی دولت لوٹتی ہے، اس کے مردوں کو قتل کرتی ہے، اس کے بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ بناتی ہے۔ اس کی سرزمین کو اس کے بیٹوں کے خون سے سیراب کرتی ہے اور اس کے درندوں کا اس کے نوجوانوں کے گوشت سے پیٹ بھرتی ہے تو اس وقت میں اپنے ملک اور ملک والوں سے نفرت کرنے لگتا ہوں۔

میں اپنی جنم بھومی کی تعریف میں قصیدے پڑھتا ہوں اور اس گھر کے شوق میں مرا جاتا ہوں، جس میں میری نشو و نما ہوئی لیکن جب کوئی راہگیر گزرتا ہے اور اس گھر میں پناہ چاہتا ہے، اس میں رہنے والوں سے روٹی مانگتا ہے اور دھتکار کر نکال دیا جاتا ہے تو میری تعریف توحد سے، اور شوق بیزاری سے بدل جاتا ہے اور میں اپنے دل میں کہتا ہوں:

"جو گھر محتاج کو روٹی کا ایک ٹکڑا اور ضرورت مند کو ایک بستر کی جگہ دینے میں بخل سے کام لے، وہ اور تمام گھروں سے زیادہ ویران و برباد کر دیے جانے کے قابل ہے!"

میں اپنی جنم بھومی سے محبت کرتا ہوں اور میری یہ محبت ملک کی محبت کا ایک جزو ہے۔ میں اپنے ملک سے محبت کرتا ہوں اور میری یہ محبت ارض وطن کی محبت کی ایک قسم ہے۔ میں خطۂ زمین سے محبت کرتا ہوں اور میری یہ محبت تمام محبت ہے، اس لیے کہ کرۂ ارض اس انسانیت —— مقدس انسانیت —— کی چراگاہ ہے جو زمین پر الوہیت کی روح ہے —— وہ انسانیت جو ویرانوں میں کھڑی ہے، جس نے اپنا عریاں جسم پھٹے پرانے کپڑوں سے ڈھانپ رکھا ہے، جو اپنے مرجھائے ہوئے رخساروں پر گرم گرم آنسو بہا رہی ہے، جو اپنی اولاد کو ایسی آواز سے پکار رہی ہے، جس نے ایتھر کو فریاد و فغاں سے معمور کر دیا ہے، لیکن اس کی اولاد اس کی آواز سے بے پروا عصبیت کے راگ الاپ رہی ہے۔ اس کے آنسوؤں سے بے خبر تلواروں کو چمکانے میں مصروف ہے —— وہ انسانیت، جو تنہا بیٹھی قوموں سے فریاد کر رہی ہے، لیکن وہ اس کی فریاد پر کان نہیں دھرتیں اور اگر ان میں سے کوئی فرد اس کی فریاد

سُن کر اس کے پاس آتا ہے۔ آنسو پونچھ کر اس کی تکلیفوں پر اسے تسلّی دیتا ہے تو قوم کہتی ہے:

"اسے چھوڑ دو! کہ آنسو کمزور ہی پر اثر کر سکتے ہیں!"

انسانیت زمین پر الوہیت کی روح ہے ـــــ وہ الوہیت جو قوموں کے قریب سے محبت بھرے لہجہ میں باتیں کرتی اور زندگی کی راہوں کی طرف اشارہ کرتی گزرتی ہے، لیکن لوگ اس پر ہنستے اور اس کے اقوال و تعلیمات کا مذاق اڑاتے ہیں ـــــ وہ اُلوہیت جس کی بات کل مسیح ناصری ؑ نے سُنی اور لوگوں نے اسے سولی پر چڑھا دیا، سقراط نے سُنی اور لوگوں نے اُسے زہر دے دیا ـــــ وہ اُلوہیت جس کی بات مسیح ناصری ؑ اور سقراط کے پیروؤں نے سُنی اور لوگوں کے سامنے اس کا نام پکار پکار کر لیا۔ لیکن وہ ان کو قتل کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ بلکہ یہ کہہ کر ان کا مذاق اڑا رہے ہیں:

"طنز و مذاق قتل سے زیادہ سنگین اور تلخ ہیں!"

اور شلیم کے باشندے مسیح ناصری ؑ کے قتل پر قادر نہ ہو سکے کیونکہ وہ ابد تک زندہ ہے اور نہ ایتھنز والے سقراط کو فنا کر سکے، کیونکہ وہ بھی ابد تک زندہ ہے اور نہ طنز و مذاق انسانیت کے کانوں اور اُلوہیت کے پیروؤں پر غالب آسکیں گے، کیونکہ وہ ابد تک ـــــ ابدالآباد تک

——زندہ دیا گئے دہیں۔

(۳۱)

تو میرا بھائی ہے اور ہم دونوں ایک ہی مقدس اور ہمہ گیر روح کے بیٹے ہیں، تو مجھ ہی جیسا ہے اس لیے کہ ہم دونوں اُن جسموں کے، اسیر ہیں جو ایک ہی مٹی سے بنائے گئے ہیں۔ تو زندگی کی راہ میں میرا رفیق اور اس حقیقت کی تلاش معلوم کرنے میں میرا معاون ہے جو بادلوں کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ تو انسان ہے اور میں تجھ سے محبت کرتا ہوں، میرے بھائی!

میرے متعلق تیرا جو جی چاہے کہہ! کیونکہ مستقبل تجھ پر اپنا فیصلہ صادر کرے گا اور تیرا قول اس کے حکم کے سامنے ایک ظاہر قرینہ اور میرے بیے اس کے انصاف کی ایک بیّن دلیل ہوگا۔

تیرا جو جی چاہے مجھ سے لے لے! کیونکہ تو وہی مال اس سے لے گا جس کے ایک حصّہ پر تیرا حق ہے اور وہی جائداد مجھ سے چھیننے گا جس پر میں نے اپنی حرص و طمع کے زیر اثر قبضہ جما یا ہے۔ تو واقعی اس کے کچھ حصّہ کا حق دار ہے، بشرطیکہ وہ حصّہ تجھے مطمئن کر سکے۔

تیرا جو جی چاہے میرے ساتھ کر! کیونکہ تو میری حقیقت کو مس کرنے پر قادر نہیں ہے۔ میرا خون بہا دے، میرے جسم کو آگ میں جھونک دے،

پھر بھی تو میرے نفس کو تکلیف نہ پہنچا سکے گا نہ اسے مار سکے گا۔ میرے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑ دے اور مجھے قید خانہ کی تاریکی میں ڈال دے، پھر بھی تو میرے فکر کو قید نہیں کر سکتا، اس لیے کہ وہ بے کراں فضا میں سیر کرنے والی ہوا کی طرح آزاد ہے۔

تو میرا بھائی ہے اور میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔

میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ تیری مسجد میں سربسجدہ ہوتا ہوں تیرے ہیکل میں جھکتا ہوں اور تیرے کلیسا میں نماز پڑھتا ہوں، اس لیے کہ تو اور میں ایک ہی دین —— روح —— کے بیٹے ہیں اور اس دین کی مختلف شاخوں کی پیشوا وہ انگلیاں ہیں جو کمالِ نفس کی طرف اشارہ کرنے والے دستِ الوہیت سے چمٹی ہوئی ہیں۔

میں تجھ سے محبت کرتا ہوں، تیری اُس حقیقت سے محبت کی بنا پر جو عقلِ عام سے وجود پذیر ہوئی ہے —— وہ حقیقت جسے میں اپنی بے بصارتی کی وجہ سے اب تک نہ دیکھ سکا، لیکن اسے مقدس سمجھتا ہوں اس لیے کہ وہ اعمالِ نفس سے تعلق رکھتی ہے —— وہ حقیقت، جو آنے والے عالم میں میری حقیقت سے ملے گی اور یہ دونوں حقیقتیں پھولوں کی مہک کی طرح مل کر ایک عام اور ہمہ گیر حقیقت بن جائیں گی، جو حسن و محبت

کے ساتھ غیر فانی رہے گی۔

میں تجھ سے محبت کرتا ہوں، اس لیے کہ میں نے ظالم قوت والوں کے مقابلہ میں تجھے کمزور پایا اور لالچی دولت مندوں کے فلک بوس محلوں کے سامنے فقیری و محتاجی میں مبتلا دیکھا۔ مجھے تیرے حال پر رونا آگیا اور اپنے آنسوؤں کی جِلمن میں سے میں نے دیکھا کہ تو انصاف کی آغوش میں ہے جو تجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور تجھ پر ستم ڈھانے والوں کا مذاق اڑا رہا تھا!

تو میرا بھائی ہے اور میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔

(۴)

تو میرا بھائی ہے اور میں تجھ سے محبت کرتا ہوں! پھر تو مجھ سے کیوں جھگڑتا ہے؟

تو میرے ملک میں کیوں آتا ہے اور ان لوگوں کو خوش کرنے کے لیے جو تیری قوت سے بزرگی اور تیری تکلیفوں سے مسرت حاصل کرتے ہیں مجھے ذلیل کرنا کیوں چاہتا ہے؟ تو اپنی بیوی اور اولاد کو چھوڑ کر دُور دراز سرزمین پر موت کے پیچھے پیچھے کیوں جاتا ہے۔ ان قائدین کی خاطر جو تیرے خون سے عزت اور تیری ماں کے غم سے عظمت و بلندی خریدنا چاہتے ہیں؟ لیکن کیا یہی عظمت و بلندی ہے کہ انسان اپنے بھائی کو پچھاڑ دے؟ نہیں!

کبھی نہیں! تو پھر ہمیں ضرور حاتان کی مدح کے راگ گاتے ہوئے قائم رہ کے لیے ایک مثال قائم کرنی چاہیئے!

بھائی! کہتے ہیں "ذات کی حفاظت کرنا" فطری اور ابتدائی قاعدہ ہے لیکن میں نے لالچیوں کو دیکھا ہے، جو تجھ سے چاہتے ہیں کہ تو اپنے بھائیوں کی گردن دبوچنے کے لیے ذلتِ نفس پر آمادہ ہو جائے۔ کہتے ہیں: "بقا کی محبت" دوسرے کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کی اجازت دیتی ہے لیکن میں کہتا ہوں "دوسروں کے حقوق کی حفاظت کرنا انسانی کارناموں میں سب سے اشرف و اجمل ہے" ہاں میں کہتا ہوں، اگر میری بقا کے لیے دوسروں کی فنا ضروری ہے تو پھر موت میرے لیے زیادہ خوشگوار اور زیادہ محبوب ہے اور اگر میں نے کوئی آدمی ایسا نہ پایا، جو مجھے قتل کرے، تو میں شریف، محب اور پاک دامن انسان کی طرح خود کو اپنے ہاتھ کے حوالے کر دوں گا تاکہ وہ مجھے ہنگامِ ابدیت سے پہلے ابدیت میں پہنچا دے۔

میرے بھائی! انانیت اندھی نفسانیت کو وجود میں لائی، نفسانیت نے عصبیت پیدا کی اور عصبیت نے اقتدار قائم کیا۔ اور یہی جھگڑوں اور غلام بنانے کی خواہشوں کا سبب ہیں۔ نفس جہالت اور ظلم کے خلاف حکمت و عدالت کی قوت سے مدد چاہتا ہے۔ لیکن وہ اس اقتدار کا منکر

ہے جو جہالت اور مظالم کو عام کرنے کے بجے کانوں سے تیز و مہلک تلواریں نکالتا ہے۔ یہی اقتدار ہے جس نے بابل کو منہدم کیا اور شلیم کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکا اور روم کو مسمار کر دیا ۔۔۔ یہی اقتدار ہے جس نے ان خون بہانے والوں اور قاتلوں کو پیدا کیا، جنہیں لوگ عظیم القدر ہستیوں کا لقب دے کر اُن کی تعریفیں کرتے رہے، جنہیں مصنفوں نے نام آور قرار دیا اور جن کے معرکوں کی حفاظت اپنے صفحات میں کرنے سے کتابوں نے انکار نہ کیا، جس طرح زمین نے اُنہیں اس وقت اپنی پشت پر اٹھانے سے انکار نہ کیا تھا جب وہ اس کے چہرے کو پاک خون سے رنگ رہے تھے۔

آہ! میرے بھائی! تونے اپنے فریب دینے والوں کے کتنے دھوکے کھائے ہیں اور اپنے نقصان پہنچانے والوں کی کتنی تعریفیں کی ہیں - حال آں کہ حقیقی اقتدار تو وہ حکمت ہے جو منصف، ہمہ گیر اور طبعی قانون کی حفاظت کرتی ہے۔ وہ عدالت کہاں ہوئی جو قاتل کو قتل اور غارت گر لٹیرے کو قید کر کے اپنے ہمسایہ ملک میں جاتی ہے اور ہزاروں آدمیوں کو قتل کرتی ہے۔ لاکھوں انسانوں کا مال لوٹتی ہے؟ متعصبین کیا کہتے ہیں ان قاتلوں کے بارے میں جو قاتل کو سزا دیتے ہیں۔ ان لیڈروں کے متعلق جو چوروں کو قید میں ڈالتے ہیں؟

تو میرا بھائی ہے اور میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اور محبت انصاف کا بہترین مظہر ہے۔ اس لیے اگر میں تجھ سے محبت کرنے میں ہر جگہ، ہر مقام اور ہر ملک میں انصاف پسند نہ رہوں، تو وہ مکار ہوں جو محبت کے شاندار لباس میں انانیت کے بھونڈے پن کو چھپائے ہوئے ہے!

خاتمہ

میرا نفس میرا دوست ہے، جو زمانہ کی سختیاں شدید ہو جانے پر مجھے تسلّی دیتا — اور زندگی کے مصائب یک جا ہونے پر میری غم گساری کرتا ہے۔ جو کوئی اپنے نفس کا دوست نہیں، وہ انسانیت کا دشمن ہے اور جو کوئی اپنی ذات میں کسی مونس و ہمدرد کو نہیں دیکھتا، وہ بعالم مایوسی مر جاتا ہے اس لیے کہ زندگی انسان کے باطن سے پھوٹتی ہے اور وہ اس کے ماحول سے کبھی نہیں آئے گی۔

میں تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں اور ضرور کہوں گا اور اگر وہ بات کہنے سے پہلے موت نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا تو میری نیابت مستقبل کرے گا۔ اس لیے کہ مستقبل ابدیت کی کتاب کا کوئی راز مخفی نہ چھوڑے گا۔

میں محبت کی بزرگی اور حسن کی روشنی میں زندہ رہنے آیا ہوں اور زندہ ہوں۔ لوگ ہزار چاہیں لیکن مجھے میری زندگی سے دور نہیں کر سکتے۔ اگر وہ میری آنکھیں پھوڑ دیں گے تو میں اپنے کانوں کے ذریعہ محبت کے راگوں اور حسن

کے ترنم سے استفادہ کرتا رہوں گا۔ اگر وہ میرے کانوں کو بہرا کر دیں گے۔ تو میں حسن کی مہک اور عاشقوں کے سانسوں سے گھُلی مِلی فضا کے لمس سے لذت اندوز ہوتا رہوں گا اور اگر وہ ہوا کے راستے بھی مجھ پر بند کر دیں گے۔ تو میں اپنی روح کے ساتھ زندگی بسر کروں گا، کیونکہ میری روح حسن و محبت کی بیٹی ہے۔

میں اس لیے آیا ہوں کہ اپنا سب کچھ ہر ایک کے لیے وقف کر دوں۔ جو کام آج میں تنہائی میں انجام دے رہا ہوں، مستقبل اسے کھُلے بندوں دُنیا پر ظاہر کر دے گا اور وہ بات جو آج میں ایک زبان سے کہہ رہا ہوں، آنے والا زمانہ ہزار زبانوں سے کہے گا۔